رجسٹرڈ نمبر اے ۶۶۴

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ ر

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیرفانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۰۲ صفحات، مجلد نو روپیہ ۹ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس و دہان ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۹۲ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

مئی اور جون کے نگار میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام" نمبر کیا، اور کیسا ہوگا

اور اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سالنامہ در اصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادت رسول اللہ سے لیکر اس وقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہو کر فنا ہو گئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ تمام حکمرانوں کے نام، ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا۔

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یوروپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے "تاریخ اسلام" کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری سنہ ۱۹۵۳ء تک اسے شایع کر سکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم کچھ کہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں۔

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے۔

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپے ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے تاکہ اسی حساب سے اس کی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

نگار

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اگست میں ختم ہوگیا اور ستمبر کا نگار آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ — شمار ۲

فہرست مضامین اگست ۱۹۵۳ء

ملاحظات - - - - - - - - ! - - - - ۳
مومن کا تغزل - - - - - - نظیر صدیقی - - - - ۶
فنِ تحریر کی تاریخ - - - - - - محمد اسحاق صدیقی - - - - ۱۳
سید اختر امام کے دو خط - - - - عبدالمالک آروی - - - ۳۱
بین الاقوامی سرمایہ - - - - - (آنسہ) عایشہ ام-اے - - ۳۸
جلوے - - - - - پروفیسر محمد معین الدین دردائی - - - - ۴۱
گاہے گاہے باز خواں - - - - - - - - - - ۴۶
اِدھر اُدھر سے - - - - - - - - - - - ۴۹
منظومات - - - علی اختر - نظر - ساقی جاوید - وجد - مانی - نریم ۵۲
مطبوعات موصولہ - - - - - - - - - - - ۵۶

"من و یزداں" کا تازہ اڈیشن

نظرِ ثانی کے بعد

شایع ہوگیا

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت معہ محصول آٹھ روپیہ دس آنے، لیکن اخیر اگست تک رعایتی قیمت پر معہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے میں مل سکتی ہے

منیجر نگار لکھنؤ

مذہبی استفسارات و جوابات

کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے :- اصحاب کہف - معجزہ و کرامت - انسان مجبور ہے یا مختار - مذہب و عقل - طوفان نوح - خضر کی حقیقت - مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں - یونس اور دہان ماہی - حُسنِ یوسف کی داستان - قارون - سامری - علم غیب - دعاقہ - لقمان - عالم برزخ - یاجوج ماجوج - ذوالقرنین - ہاروت ماروت - کوثر - مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا - حدیث پر تاریخی و فنی گفتگو - مذہب و مذہبیات - امام مہدی - سیرۃ نبوی - آتش نمرود وغیرہ -

قیمت علاوہ محصول پانچ روپے آٹھ آنے

منیجر نگار لکھنؤ

ملاحظات

پاکستان کا مستقبل

جولائی کی تین تاریخیں ۲۵ر، ۲۶ر، ۲۷ر جن کا ہندوستان اور پاکستان دونوں کو انتظار تھا گزر گئیں اور گو وہ اپنے ساتھ کوئی نیا روشن اُفق لیکر نہیں آئیں، لیکن یہی کیا کم ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات پر جو سیاہ بادل چھائے تھے ان کے کناروں سے روشنی کی جھلک نظر آنے لگی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ روشنی کسی نئے آفتاب کے طلوع کا پیش خیمہ ہو۔

اس وقت نہرو، محمد علی کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یقیناً اُس گفتگو سے بہت مختلف ہے جو اس سے قبل نہرو اور لیاقت علی خاں میں ہوئی تھی اور ایسا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ نہرو لیاقت علی گفتگو کا نفسیاتی پس منظر کچھ اور تھا اور نہرو محمد علی گفتگو کا نفسیاتی پس منظر کچھ اور ہے۔

نوابزادہ مرحوم کی ملاقات کا پس منظر تھا — "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں"۔ اور اب نہرو محمد علی کی ملاقات بڑی حد تک بے حجابانہ و مخلصانہ ہوئی ہے اور وہ "دشنہ" جو پہلے آستینوں میں چھپا ہوا تھا اس مرتبہ نکال کر پھینک دیا گیا تھا۔

جو بیانات اسوقت تک شایع ہوئے ہیں، وہ بہت امید افزا ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آغاز ستمبر (جب وزیر اعظم پاکستان دہلی تشریف لائیں گے) بعض مسایل طے پا جائیں اور ان کے بارہ میں کسی مختتم فیصلہ کا اعلان ہو جائے، امید ہے کہ ان مسایل میں متروکہ جائداد، ریلوں کی براہ راست آمد و رفت، اور پاسپورٹ و ویزا کے معاملات بھی شامل ہوں گے اور اگر یہ حسب مراد طے پا گئے، تو پاکستان و ہندوستان کے باشندوں کے باہمی تعلقات جذباتی و تجارتی دونوں حیثیتوں سے زیادہ خوشگوار و استوار ہو جائیں گے اور اس کا نفسیاتی اثر کشمیر کے مسئلہ پر بھی ضرور پڑے گا جو یقیناً سب سے زیادہ اُلجھا ہوا مسئلہ ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سب سے پہلے کشمیر ہی کے مسئلہ پر گفتگو ہوگی، لیکن یہ نہرو اور محمد علی کی بڑی دانشمندی تھی کہ انھوں نے سب سے پہلے چھوٹے مسایل کو سلجھانے کی کوشش کی، کیونکہ کشمیر کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے زیادہ صاف و خوشگوار فضا کی ضرورت تھی اور یہ اسی طرح پیدا ہو سکتی تھی کہ پہلے چھوٹے چھوٹے مسایل کو طے کر کے دونوں ملکوں کے باشندوں میں ایک حد تک ذہنی سکون کی کیفیت پیدا کر دی جائے۔

کشمیر کے مسئلہ پر بھی یقیناً گفتگو ہوئی ہوگی لیکن غالباً صرف اصول کی حد تک اور اگر اصولاً اس بات پر دونوں متفق ہو گئے ہیں کہ یہ مسئلہ بھی آپس ہی میں طے کر لیا جائے اور کسی تیسری قوت کو دخل دینے کا موقع نہ دیا جائے (جیسا کہ نہرو محمد علی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے) تو ہم سمجھتے ہیں کہ نصف دشواری ختم ہو جائے گی اور باقی نصف دشواری کے ختم کرنے میں گو وقت کافی صرف ہو جائے لیکن وہ کسی مزید اُلجھن کا باعث نہ ہوگی۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ نہرو محمد علی کی یہ ملاقات بڑی مبارک ملاقات تھی اور اگر یہ سلسلہ برابر جاری رہا تو —

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے سامنے اس وقت خارجی مسایل سے زیادہ داخلی مسایل زیادہ توجہ طلب ہیں اور وہ اس حد تک تشویشناک ہیں کہ اگر تمام خارجی مسایل پاکستان کی خواہش کے مطابق طے پا جائیں تو بھی وہ کوئی فایدہ نہیں اُٹھا سکتا بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ کہیں ابتری اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔

وہ داخلی مسایل کیا ہیں؟ ان کی تفصیل، پاکستان ہی کے ایک ممتاز صحافی کی زبان سے سنئے، جس نے پاکستان کے موجودہ معاشی نظام کی ابتری اور وہاں کے اکابر کی اخلاقی پستی پر بے باکانہ روشنی ڈالی ہے۔

یہ زوال پذیر معاشرہ!

اس کی وجہ اخلاقی ہوں یا سماجی، بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج ہم جس معاشرہ کے رکن ہونے پر فخر کرتے ہیں وہ ہر لحاظ سے مائل بہ انحطاط ہے اور اب اس کے زوال و انحطاط کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ وہ لوگ جو حقایق کو نظر انداز کرنے کے عادی تھے، اعتراف کرنے لگے ہیں کہ واقعی صورت حال خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے اور اسکی اصلاح کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے، خصوصیت کے ساتھ قیام پاکستان کے بعد تو قومی اخلاق اور قومی کردار کے زوال کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ ہم آج بھی اس معاشرے کے رکن ہیں جو پاکستان کی آزاد مملکت سے قبل ہمارے لئے سرمایۂ فخر تھا، جس شعبۂ زندگی پر نظر ڈالئے محسوس ہوگا کہ شرافت افکار اور دیانت کردار کا فقدان ہے، تاجروں کی برادری ہو یا سرکاری اہل کاروں کی جماعت، ارباب اختیار کا گروہ ہو یا عام شہریوں کی سوسائٹی، زندگی اعلیٰ اقدار سے تقریباً تہی دست نظر آتی ہے، ممکن ہے کہ پاکستان کے عام شہروں اور قصبات میں یہ حالات نہ ہوں کیونکہ وہاں مسابقتِ حیات اور کارزارِ زندگی کی رفتار سست ہے، لیکن کراچی جیسے تجارتی شہر اور بین الاقوامی مرکز میں تو یہ چیز اس قدر واضح اور یہ خصوصیت اس درجہ نمایاں ہے کہ کوئی شخص اس سے آنکھیں موند کر نہیں گزر سکتا۔ رشوت، بددیانتی، تغلب، بے اعتباری، اعصابی بدحواسی اور فکری انتشار عام ہے اور طبقہ عام کو تین تین اور چار چار ہزار روپے تنخواہ پانے والے عہدہ داروں سے لیکر، جو زندگی کے بڑے اونچے مقام پر فائز ہیں ــــ معمولی شہریوں تک جنھیں زندہ رہنے کی ابتدائی ضروریات تک میسر نہیں، ہر شخص انہی نفسیاتی اور ذہنی امراض میں مبتلا نظر آتا ہے، ہر شہری اس مقصد کے لئے تگ و دو کر رہا ہے کہ استحقاق سے زیادہ حاصل کرے خواہ اس کے نتیجے میں ہزاروں حق داروں کا حق ہی کیوں نہ مارنا پڑے، جن لوگوں سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ جائز و ناجائز مفادات کے لئے ضمیر فروشی کریں گے، وہ بھی ضمیر فروشی کرتے ہیں اور انھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ کیا کر رہے ہیں، جن بزرگوں کی اعلیٰ خیالی اور بلند نظری مسلمات کا درجہ رکھتی تھی وہ اب ایک بازاری انسان کی طرح پست خیالی اور تنگ نظری کا شکار ہیں، تاجروں کے گروہ میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو حصول زر کے شریفانہ ذرایع کو پس پشت ڈال کر دن رات اس فکر میں جلا رہتے ہیں کہ کسی طرح بلیک مارکیٹنگ اور اسمگلنگ کے ذریعہ اپنی تجوریاں بھریں، جو ارباب اختیار مملکت کے کلیدی عہدے دبائے بیٹھے ہیں ان کا نصب العین (قیام پاکستان کے بعد) یہ بن گیا ہے کہ جس طرح ممکن ہو وہ ان کلیدی عہدوں پر قابض رہیں، جن بزرگوں کو قیادت کا دعویٰ اور لیڈری کا ادعا ہے، ان کی ایک ہی تمنا ہے اور وہ یہ کہ قیادت کے زینے پر قدم رکھتے ہوئے وزارت کے بام بلند تک پہونچ جائیں، غرض سفاہت، کمینگی، ایمان فروشی، تلبیس، مکر و فریب، بے ضمیری اور اخلاقی انحطاط کا ایک طاعون ہے جس نے پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، بعض اوقات تو خود اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے، اس موقع پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد قومی معاشرے میں یہ انحطاطی کیفیت کس طرح رونما ہو گئی؟ ہم عہدِ غلامی میں کہا کرتے تھے کہ تمام اخلاقی عیوب و مفاسد کا سرچشمہ "محکومی اور غلامی" ہے، جونہی ہم غیر ملکی اقتدار کے جوئے سے آزاد ہوئے، ہمارا دعویٰ تھا کہ تمام اخلاقی اور سماجی عیوب کا قلع قمع ہو جائے گا۔ لیکن گزشتہ چھ سال کی آزاد زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ یہ خیال قایم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ تمام "مفاسد و معائب" کا سرچشمہ پچھلی سیاسی غلامی نہ تھی، بلکہ یہ موجودہ سیاسی آزادی ہے جس نے ہمیں صرف غیر ملکی اطاعت کے بندھنوں سے آزاد نہیں کر دیا بلکہ اُن تمام رشتوں کو بھی کاٹ کر پھینک دیا جو ایک اعلیٰ اور صالح معاشرے کی شیرازہ بندی کے لئے تار و پود کا حکم رکھتے ہیں ــــ اس سلسلہ میں کامل غور و فکر سے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد لامحالہ ذہن چند نتایج تک پہونچتا ہے۔ ہم آزادی سے قبل اس خیال خام میں مبتلا تھے کہ تمام برائیوں کی جڑ دوسروں کی سیاسی محکومی ہے لیکن تجربہ نے بتایا کہ فقط سیاسی محکومی ہی سرچشمۂ مصائب نہیں ہے، قومی کردار کے لئے سیاسی آزادی بھی اتنی ہی خطرناک اور نقصان رساں ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ معاشی خوش حالی اور سماجی استحکام کے مقاصد کی تکمیل کا سامان موجود نہ ہو، متحدہ ہندوستان میں حصولِ آزادی کے جوش اور قومی عزت و خود مختاری کے انقلابی جذبے نے قوم کی صفوں میں ایک مصنوعی اتحاد پیدا کر دیا تھا۔ ہم سب مسمریزم کے معمول کی طرح ایک ساتھ چند اشاروں پر حرکت کرتے تھے، انفرادی اغراض اس خوبصورتی کے ساتھ اجتماعی مفادات کے سانچے میں ڈھل گئی تھیں کہ عمومی زندگی بڑی خوشگوار نظر آتی تھی۔ ہمارے اپنے معاشرے کی تہوں میں جو داخلی تضادات موجود تھے وہ وقتی طور پر دب گئے تھے کیونکہ پوری قومی توانائیاں

ایک اور عظیم تر مقصد کے حصول کے لئے صرف ہو رہی تھیں، یہ بالکل ایسی ہی مثال ہے جس طرح ایک شخص بیک وقت طاعون، زکام، کھانسی اور خارش میں مبتلا ہو جائے اس صورت میں وہ بخار، کھانسی، زکام اور خارش کی فکر چھوڑ کر سب سے پہلے "طاعون" کا علاج کرے گا کیونکہ زندگی کے لئے سب سے بڑا خطرہ وہی ہے، انگریزوں کی غلامی ہمارے اجتماعی وجود کے لئے "طاعون" کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہم نے بڑے پرجوش طریقے پر اس "مرض مہلک" کا علاج کیا اور بظاہر اس سے شفایاب ہو گئے لیکن اس "بڑے مرض" کے دور ہوتے ہی دوسرے امراض نے سر اُبھارا اور آخر طاعون کا مارا ہوا مریض دوسری بیماریوں کے ہاتھوں جاں بلب ہو گیا، آج ہماری مثال اسی "جاں بلب مریض" کی سی ہے، بے شک سیاسی آزادی ہمیں حاصل ہو گئی — لیکن کیا وہ معاشی خوشحالی، اقتصادی استواری اور سماجی استحکام بھی نصیب ہو گیا؟ جس کے بغیر سیاسی آزادی محض مذاق کی حیثیت رکھتی ہے!

قیام پاکستان سے قبل یقیناً ہم پر ایک قوم کا اطلاق ہوتا تھا کیونکہ ہم سب کا نصب العین حیات ایک تھا! لیکن اب ہم اپنے کو ایک "قوم" نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اب ہمارے مقاصد حیات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، ہر فرد اپنے طبقاتی مفاد کے لئے کوشاں ہے، ہر شخص اپنی ذاتی اغراض کے پیچھے سرگرداں ہے، ملک میں جو ایک خاص قسم کی سیاسی ناپختگی کی کیفیت نظر آتی ہے اُس نے سماجی زندگی کے ڈھانچے کو اور بھی متزلزل کر دیا ہے، مستقبل کی طرف سے بے یقینی اور اس اندیشہ نے کہ خدا جانے کل کیا ہو جائے، نفع اندوزی اور منفعت ذاتی کی اس جنگ کو بیحد شدید کر دیا ہے، افلاس، بے روزگاری، اور ناامیدی ایک ایسی دیگ میں اُبالے جا رہے ہیں جس میں خود غرضی — بے اعتباری، ہوسناکی، لالچ، تن آسانی اور ضمیر فروشی کے مہیب مادے کھد بد پک رہے ہیں اور جس کے نیچے جہنم کی آگ جل رہی ہے!

کیا اس ذلیل انحطاط پذیر اور جاں بلب معاشرے میں کوئی شخص اطمینان قلب محسوس کر سکتا ہے؟ کیا ایسے ماحول میں سکون [illegible] کا سامان فراہم ہو سکتا ہے؟ نہیں بالکل ناممکن ہے کہ ایسا ہو اور جب ایسا ہونا ممکن نہیں تو آخر کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ اس معاشرے میں تخلیقی صلاحیتیں نشو و نما پا سکیں گی؟ انسان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے بڑا "صالح ماحول" چاہئے، یہ صالح ماحول فقط بے جان پرستی سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کی ضرورت ہے جو سماج کے معاشی تضاد کو رفع کر دے۔ جب تک ان معاشی تضادات کو دور کر کے ایک ایسی سوسائٹی کی تخلیق نہ کی جائے گی جو معاشی نابرابری اور سماجی عدم مساوات کے زہر سے مسموم نہ ہو، تب تک ہم امید نہیں کر سکتے کہ اپنے تصور کا معاشرہ تخلیق کر سکیں، ہمارے وزیر اعظم اور ان کے رفقاء پاکستان کے شاندار مستقبل کی نسبت عجیب عجیب دلخوش کن تصورات رکھتے ہیں اور موقع بے موقع ان کا اعلان بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن جب تک وہ صحیح تشخیص نہ کر سکیں گے قومی امراض کا صحیح اور برمحل علاج ممکن نہیں!

یہ ہے داستان پاکستان کے موجودہ معاشی نظام کی جسے وہیں کے ایک معزز صحافی نے بیان کیا ہے اور جس کے غیر صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

میں بھی اس سے قبل بارہا ظاہر کر چکا ہوں کہ پاکستان کو سب سے زیادہ ضرورت مخلص کام کرنے والوں کی ہے، جو عوام کا اعتماد حاصل کر سکیں اور سب سے پہلے معاشی نظام کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں، لیکن کس درجہ افسوسناک امر ہے کہ پچھلے چھ سال کے اندر پاکستان کوئی قدم اصلاح و ترقی کی طرف نہیں اٹھا سکا۔ موجودہ وزارت نے ایک نیا ورق اُلٹنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ ورق بالکل سادہ ہونا چاہئے اور اس سے قبل جو رطوبات کوتاہ بینی اور غلط اندیشی کی پائی جاتی تھیں ان سے اس ورق کو بالکل پاک ہونا چاہئے۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ پاکستان کا مستقبل ان مسایل سے وابستہ نہیں ہے جن کا تعلق ہندوستان سے ہے، بلکہ خود اپنی اندرونی اصلاح سے ہے اور جب تک اس میں کامیابی نہ ہوگی اس کا مستقبل ہمیشہ خطرات سے گھرا رہے گا۔

مومن کا تغزل

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جس طرح دیوان مومن کے زیادہ تر اشعار خیالات و مضامین کے اعتبار سے صحیح رنگِ تغزل کے آئینہ دار نہیں اُسی طرح مومن کا انداز بیان بھی غزل کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ غزل کی لطافت طریق اظہار کے پیچ و خم اور آورد و تصنع کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن مومن کے طرز ادا کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ پُرتکلف ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر پیچیدہ ہے کہ بقول پروفیسر ضیاؔ کے "تقریباً ہر غزل کے نصف اشعار محتاج شرح ہیں۔" کیا ان کا اسلوب اس وجہ سے پیچیدہ اور تصنع آمیز ہے کہ ان کے خیالات بہت ہی نازک اور گہرے ہیں؟ یا اس لئے کہ انھوں نے اپنے پیچیدہ اور پر تکلف اسلوب سے سچے اور گہرے جذبات و محسوسات کی خانہ پُری کی ہے؟ یا پھر کوئی اور سبب ہے؟ پروفیسر ضیاؔ کے خیال میں اس کی وجہ "ان کی منفرد شخصیت ہے جو کبھی روشِ عام پر چلنا گوارا نہیں کرتی ...... مومن ایک Genius یا نابغہ تھے اور نابغہ مخصوص فوق العادہ ذہنی اور تخلیقی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر انھوں نے اپنے مطالب کے ادا کرنے کے لئے ایک نیا اور غیر متعارف پیرایہ ایجاد کیا تو کیا تعجب ہے۔ اس کے علاوہ سب جانتے ہیں کہ ان کا عشق حقیقی نہیں مجازی ہے۔ مجاز بھی وہ جس سے ہوس پرستی اور کوچہ گردی کی بو آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عشق میں برشتگی اور نامرادی، ربودگی اور خود فراموشی کا کیا کام وہاں تو عاشق یہ چاہتا ہے کہ تھوڑے سے تھوڑے ایثار کے سہارے معشوق سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے عجب نہیں کہ اس داؤ پیچ کے کاروبار نے ان کو متصنع اور پیچ دار باتوں کا خوگر بنا دیا ہو۔ پروفیسر کلیم نے سوداؔ کی نسبت کہا ہے کہ وہ مصنوعی خیالات کو اصلی کر دکھاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مومن اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرتے ہیں۔"

پروفیسر موصوف کی یہ معصومانہ توجیہ جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر غلط بھی ہے اس باب میں انھوں نے عشق مجازی کو خواہ مخواہ بدنام کیا ہے۔ آخر جرأت کا عشق بھی تو مجازی ہی تھا اور ویسا ہی مجاز جیسا مومن کے یہاں پایا جاتا ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک کے اسلوب میں تو قابلِ رشک سادگی اور بے ساختگی ہے مگر دوسرے کے انداز بیان میں بیزار کن الجھاؤ اور بناوٹ۔ دوسرے یہ کہ مومن کے اشعار میں جو پرتصنع اور پیچ دار باتیں ہیں اُن کو اس داؤ پیچ سے دور کا بھی تعلق نہیں جس سے ایک ہوس پرست کام لے سکتا ہے یا کام لیا کرتا ہے۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مومن اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرتے ہیں مومن اپنے مصنوعی انداز میں جو چیزیں پیش کرتے ہیں ---------------......، وہ اور جو کچھ بھی ہوں جذبات یقیناً نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کے اسلوب میں تکلف اور پیچ و خم کئی وجہوں سے پیدا ہوئے اول تو اس لئے کہ ان کے اکثر پیچیدہ اشعار حد درجہ لایعنی مضامین پر مبنی ہیں اسی لئے وہ پڑھنے والے کو پیچ دار اور اُلجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ مومن بعض اوقات بہت وسیع مضمون کو ایک شعر میں ادا کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی وسیع مضمون کو دو مصرعوں کے پیمانے میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کے بعض اجزاء کو لازمی طور پر چھوڑ دینا پڑے گا۔ اب چونکہ مومن کے مضامین زیادہ تر تخیلی اور مفروضاتی ہوتے ہیں اس لئے ان کے چھوڑے ہوئے اجزاء مشکل سے سامع کے ذہن میں آتے ہیں۔ نتیجتاً شعر پیچ دار بن جاتا ہے۔ تیسرے اس لئے کہ بسا اوقات مومن کے اشعار ایہام پر

مبنی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی مطلب بہ یک نظر سمجھ میں نہیں آتا۔ چوتھے اس لئے کہ مومن کے زیادہ تر اشعار کی بنیاد روایتی مضامین پر ہے۔ ان میں ندرت و تازگی پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ وہ سیدھے سادے پیرایہ میں بیان نہ کئے جائیں۔ پانچواں سبب یہ ہے کہ مومن کے بعض اشعار کا سمجھنا بعض باتوں کے جاننے پر منحصر ہے اب جو کوئی ان باتوں سے ناواقف ہے اس کو مومن کا اسلوب قدرتی طور پہ پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ ان خیالات کی تصدیق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

سرگرم مدحِ غیر دمِ شعلہ زن سے ہے   دوزخ کو کیا جلن مرے دل کی جلن سے ہے

اس شعر میں پیچیدگی کے دو سبب کا اجتماع ہے۔ اول تو نفسِ مضمون ہی اس قدر مہمل ہے کہ اس تک سامع کا ذہن آسانی سے نہیں پہونچ سکتا۔ دوم یہ کہ شعر میں نفسِ مضمون کے بعض اجزا محذوف ہیں اور چونکہ مضمون سرتاسر خیالی اور مفروضاتی ہے اس لئے محذوفات کی طرف خیال فوراً منتقل نہیں ہوتا۔ اس شعر کا جو مطلب الفاظ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ دوزخ اپنے شعلوں کی لپٹ سے رقیب کی مدح میں سرگرم تو اس کا سبب یہ ہے کہ دوزخ کو میرے دل کی جلن پر رشک آتا ہے۔ یہ مطلب سُن کر آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ آخر بات کیا ہوئی۔ عاشق اور رقیب کا دوزخ سے کیا تعلق۔ پھر یہ کہ دوزخ کے شعلے رقیب کی تعریف میں کیوں سرگرم ہیں اور ان کو عاشق صادق یعنی حضرت مومن کے دل کی جلن پر رشک کیوں ہے یہ تو خیر مومن ہی بتا سکتے تھے کہ دوزخ کے شعلے ان سے اور ان کے رقیب سے کیوں دلچسپی لینے لگے اور بالفرض ایسا ہوا بھی تو اس کی اطلاع مومن تک کیونکر پہونچی۔ یعنی جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب شعر کے محذوفات میں مل جاتا ہے۔ محذوفات کے ساتھ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "دوزخ اپنے شعلوں کی لپٹوں سے رقیب کی مدح میں سرگرم ہے اور میرے سوزِ دل کی (جو دوزخ سے کہیں زیادہ ہے) تعریف نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو میرے دل کی جلن پر رشک آتا ہے۔ یعنی چونکہ وہ سوز میں مجھ سے کمتر ہے اس لئے مجھ پر حسد کرتا ہے اور میرے جلانے کے لئے رقیب کی تعریفیں کرتا ہے جو سوزِ عشق سے خالی ہے۔"

مومن :۔   کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس   سب کاوشِ رقیب بجا کوہکن سے ہے

یہ شعر بھی اسلوب کے اعتبار سے پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی پیچیدگی کا اصل سبب نفسِ مضمون کی نوعیت ہے۔ شعر کا مفہوم پروفیسر ضیا کے الفاظ میں یہ ہے کہ "کوہکن نے پتھر کاٹ کر نہر نکالی اور اپنی محبوبہ کی سنگ دلی کا پاس نہ کیا۔ یعنی پاسِ ادب کا تقاضا تو یہ تھا کہ پتھر کو دلِ یار سے مشابہ سمجھ کر اس کا احترام کرتا۔ مگر نہ کیا۔ اس لئے خسرو کی دشمنی اس سے بالکل حق بجانب ہے۔"[1]

اول تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ کوہکن یعنی فرہاد کی رودادِ محبت سے مضمون پیدا کرتے وقت مومن نے اس کی محبوبہ یعنی شیریں کی سنگ دلی کا تذکرہ کیوں کیا جب کہ وہ سنگدل ہرگز نہ تھی۔ شاید مومن نے اس باب میں دادِ تحقیق دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ خیر مانا کہ شیریں سنگ دل تھی اور ایک عاشقِ صادق پر محبوب کی ہر اچھائی برائی کا احترام واجب سہی لیکن اس کا یہ مطلب لینا کیا معنی دارد کہ اگر محبوب سنگ دل واقع ہوا ہے تو عاشق کو چاہئے کہ دنیا میں جتنی بھی سنگین چیزیں ہیں مثلاً پہاڑ، کنکر، پتھر ان سب کو احترام اور محبت کی نگاہ سے دیکھے۔ دو مصرعوں میں مومن نے جتنی لغویتیں بھر دی ہیں ان کو کہاں تک واضح کیا جائے۔ ان لغویات کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ مومن کے اسلوب کی

---

[1] یہ مطلب "دیوانِ مومن" مرتبہ پروفیسر ضیا سے نقل کیا گیا

پیچیدگی اور بناوٹ بڑی حد تک ان کے لایعنی خیالات کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ بقول پروفیسر ضیا اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرنے کا

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا مومن کے اسلوب میں پیچیدگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے بہت سے اشعار ایہام پر مبنی ہوتے ہیں۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں :-

گر بہائے خون عاشق ہے وصال
انتقام زحمت جلاد کیا ؟

اس شعر کا مطلب اثر لکھنوی کے الفاظ میں سنئے۔ لکھتے ہیں۔ " اس شعر میں ایہام ہے۔ وصال کے معنی وصل کے بھی ہیں اور مرنے کے بھی۔ پہلے مصرع میں ایک زبردست نظریہ قایم کیا ہے کہ وصال قتل عاشق کا معاوضہ ہے۔ مگر دوسرے مصرعہ میں اس کو غلط ثابت کیا ہے کہ وصال بہائے خونِ عاشق نہیں ہے (اب لفظ وصال بمعنی مرگ لینا ہوگا) بلکہ اس زحمت کا انتقام ہے جو جلاد کو قتل کرنے میں پیش آئی اگر ایسا نہیں ہے تو اس زحمت کا بدلہ کیا ہے "

اثر صاحب کی اس تشریح سے یہ بات تو واضح ہو ہی گئی کہ اس شعر کی عمارت ایہام پر مبنی ہے۔ لیکن مجھے اتنا اشارہ اور کرنا ہے کہ اس شعر کو گورکھ دھندا بنانے میں ایہام کے علاوہ نفس مضمون کی لغویت کو بھی بڑا دخل ہے۔

مومن :- کیوں کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا
اب تو باندھوں گا میں ناصح اسکو بھی زنجیر سے

اس شعر کے الفاظ سادہ ہیں لیکن شعر پیچیدہ ہے اور اس پیچیدگی کا سرچشمہ " سر پھرنے لگا " کا ٹکڑا ہے۔ پروفیسر ضیاء کے الفاظ میں شعر کا مطلب یہ ہے :- " ناصح نے کہیں کہدیا کہ تجھے نصیحت کرتے کرتے میرا سر پھرنے لگا مگر تجھ پر اثر نہیں ہوتا۔ عاشق دیوانہ جواب دیتا ہے کہ جب میں آوارہ پھرتا تھا تو میرے پاؤں میں زنجیر ڈالی گئی تھی۔ اب تیرا سر پھرتا ہے تو اس کو میں زنجیر سے باندھوں گا "

اس شعر کے نفس مضمون کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ اس سے اس طالب علم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے " میرا سر چکر کھا رہا ہے " کا انگریزی ترجمہ یوں کیا تھا۔

مومن :- ذکر کر بیٹھے برائی سے ہی شاید میرا
اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

کہنا یہ مقصود ہے کہ " ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں " اس خیال میں نہ کوئی گہرائی ہے اور نہ تازگی۔ لیکن شعر پھر بھی پیچیدہ ہے اور یہ پیچیدگی انداز بیان میں صرف اس لئے پیدا کی گئی کہ ایک فرسودہ خیال میں تازگی سی آ جائے۔

مومن :- حیرت حسن سے یہ شکل بنی
کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

اس شعر کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ جب کسی کی موت کے متعلق پورا یقین کرنا ہوتا ہے تو اس کے منہ کے قریب آئینہ لیجاتے ہیں کہ اگر ذرا بھی سانس ہوگی تو آئینہ پر نم پیدا ہو جائے گا جو شخص اس امر سے ناواقف ہے اس کو مومن کا مندرجہ بالا شعر قدرتی طور پر پیچیدہ معلوم ہوگا۔

جس طرح غزل کے اسلوب کا پرپیچ اور تکلف آمیز ہونا ایک عیب ہے اسی طرح غزل میں علمی اصطلاحات کا استعمال بھی مستحسن نہیں۔ غزل میں علمی اصطلاحات کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے ریشم کے کپڑے میں ٹاٹ کی پیوند کاری۔ لیکن پروفیسر ضیا کی پرستارانہ عقیدت کلام مومن کے اس بدنما داغ کا اعتراف کیونکر کرتی۔ چنانچہ انھوں نے اس عیب کو خوبی میں تبدیل کرنے کے لئے بڑی حسین دلیل پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں " حکیم صاحب کی مستجمع الصفات ذات متعدد علوم و فنون کی سرمایہ دار تھی۔ اسلئے کلام میں علمی اصطلاحات کا بلاقصد آجانا ناگزیر تھا۔ قصاید میں تو اس سے چارہ نہیں۔ ان کی غزلیات میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ جھلکتا ہے مگر خوبی یہ کہ تغزل کی شان بدستور قایم رہتی ہے اور ان علمی مسایل کی حیثیت ثانوی رہجاتی ہے " پروفیسر ضیا نے اپنے اس دعوے کی تائید میں چند اشعار بھی پیش کئے ہیں ان میں سے دو تین شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اور محظوظ

کے ذوق سلیم کی داد دیں کہ اس کی بدولت ان اشعار کی تغزلانہ شان ہم لوگوں پر منکشف ہوئی ہے ؎

صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے   رجعت قہقہری شمس و قمر آخر شب
دشمنِ سگ کوچہ نہ ہوا اس شوخ آہو چشم کا   نادم ہوں کعب گرگ پائے نامہ بر سے باندھکر
قران انجم سیارہ برج آبی ہیں   ڈبوئیگی مری چشم ستارہ بار مجھے

شعریت کے فقدان کی بنا پر اول تو ان اشعار کو اشعار کہنا ہی غلط ہے چہ جائیکہ ان کو غزل کے اشعار تسلیم کر لینا اور ان میں شانِ تغزل کو جلوہ گر پانا۔

مومن کے اسلوب کو پرپیچ اور تصنع آمیز قرار دیتے وقت مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ دیوانِ مومن میں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں سادگی اور بے ساختگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن چونکہ ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے اس لئے انکو مومن کے مخصوص رنگ سے علحدہ سمجھنا نامناسب نہ ہوگا اور اسی بنا پر مجھے یہ خیال آتا رہا ہے کہ جہاں مومن نے تغزل کا حق ادا کیا ہے وہاں وہ اپنے انفرادی اسلوب کو قایم نہیں رکھ سکے اور جن اشعار میں انھوں نے اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے کام لیا ہے ان میں تغزل کے مطالبات کہیں کہیں پورے ہو سکے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے اپنے اس خیال کا اظہار پروفیسر حامد حسن قادری صاحب کے نام ایک خط میں کیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا:

"آپ کا خیال صحیح ہے کہ مومن خاں سے مخصوص رنگ اور تغزل ساتھ ساتھ نہیں نبھتے اور نبھ بھی نہیں سکتے۔ پیچ پیچ میں بے ساختگی کہاں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ جب وہ دور کی کوڑی لاتے ہیں تو اکثر پورا شعر اور سارا مضمون بے لطف ہو جاتا ہے لیکن کہیں کہیں بات دلچسپ اور خوبصورت بھی نکل آتی ہے۔"

نیاز فتحپوری نے مومن کی نفسیاتی ژرف بینی پر زور دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میرے خیال میں مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھ کر شاعری کرتا ہے اور ایسی معنوی نزاکتیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجزیہ کرنے کے بعد ان کا پتہ چلتا ہے۔" جہاں تک مومن کی شاعری کا تعلق ہے معنوی نزاکتوں کا تو ذکر ہی کیا معمولی بات کا بھی اس وقت تک پتہ نہیں چلتا جب تک غور و تامل اور دماغ سوزی سے کام نہ لیا جائے۔ البتہ ان کی شاعری میں نفسیاتی رموز کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو صرف مومن ہی کے حصے میں آئی ہو۔ اگر دیانت کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ہر غزل گو شاعر کے یہاں کسی نہ کسی مقدار میں ایسے اشعار ضرور ملیں گے جو نفسیاتی رموز کے حامل ہوں گے۔

نفسیاتی رموز کو مومن کی خصوصیت خاصہ قرار دینا انتقادی دیانتداری سے بعید ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص غزل جیسی داخلی صنف میں شاعری کرے اور فطرت انسانی کی نفسیات سے بیگانہ رہ کر ایک بڑا شاعر بن جائے یہ اور بات ہے کہ غزل کے اچھے اور برے شاعروں میں بعض کے نفسیاتی رموز کم ہیں اور بعض کے یہاں زیادہ

فراق گورکھپوری نے اپنے مقالہ "حسرت موہانی" میں مومن کے متعلق کئی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے فارسی ترکیبوں کے ذریعہ سے حسن و عشق کی نفسیاتی و داخلی کیفیتوں کی عکاسی کی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ فراق صاحب کا خیال غلط ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ انھوں نے مومن کے کلام میں نفسیاتی و داخلی کیفیتوں کی عکاسی کا ذریعہ خصوصیت کے ساتھ فارسی تراکیب کو کیوں قرار دیا۔ جب کسی شعر میں کوئی نفسیاتی یا داخلی کیفیت ظاہر کی جائے گی تو اس کے لئے سادہ الفاظ بھی اتنا ہی کام آسکتے ہیں جتنا کہ فارسی تراکیب۔ اب یہ شاعر کے اختیار میں ہے کہ وہ حسب موقع شعر میں سادہ الفاظ استعمال کرے یا فارسی تراکیب۔ چنانچہ مومن نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اُن کے کلام میں فارسی تراکیب کا استعمال اور نفسیاتی و داخلی کیفیات کا اظہار لازم و ملزوم کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جو فارسی

تراکیب کے باوجود کسی نفسیاتی یا داخلی کیفیت کی ترجمانی نہیں کرتے (اور کرتے کیسے جب کہ ان اشعار کا موضوع کوئی نفسیاتی یا داخلی کیفیت ہے ہی نہیں) اس کے برعکس مومن کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں زبان و بیان کی سادگی کے باوصف محبت کی نفسیات اور داخلی کیفیات کی بڑی اچھی مصوری کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
پاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی   بات اپنی امیدواری کی
مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے   رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
کہنا پڑا درست کہ اتنا ہے لحاظ   ہر چند وصل غیر کا انکار ہے غلط
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم   منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

پرستارانِ مومن کی ایک دلچسپ ادا یہ ہے کہ وہ کلام مومن کی تقریباً ہر خوبی کو صیغہ "افضل التفضیل" یعنی میں بیان کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ضیا اور پروفیسر وقار عظیم نے مومن کی طنز نگاری کا ذکر بھی اسی انداز میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مومن کے یہاں طنز کی بڑی پاکیزہ مثالیں ملتی ہیں لیکن پروفیسر ضیا کا یہ کہنا کہ "اساتذۂ اردو میں مومن سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا" اور پروفیسر وقار عظیم کی یہ رائے کہ "طنز ادبی فن کا ایک ایسا حربہ ہے جسے اردو کے غزل گو شاعروں میں سے کسی نے بھی اتنے سلیقہ اور لطافت سے استعمال نہیں کیا جیسے مومن نے" مبالغے سے خالی نہیں۔ اردو شعرا میں کم از کم میر اور غالب کے یہاں طنز کا استعمال مومن سے زیادہ نہ سہی لیکن کم بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ان دونوں کے طنزیات میں بھی وہی لطافت اور نشتریت پائی جاتی ہے جو مومن کے طنزیہ اشعار کی خصوصیت بتائی گئی ہے۔ ثبوت کے لئے میں یہاں مومن، میر اور غالب کے چند بہترین طنزیہ اشعار پیش کرتا ہوں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں ؎

مومن :- واقعی سجدۂ در ایسی ہی تقصیر ہے اب   جور جو بندہ پہ ہوتا ہے بجا ہوتا ہے،
ہوں سزاوار ستم میں نے کیا ہے جرم عشق   بوالہوس ہیں بے گنہ پھر کیوں ڈریں تعزیر سے
رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے،   میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
مجھ پہ بعد امتحاں بھی جور کم کیونکر کریں   وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیونکر کریں
گر نہ کھیلیں، جان پر، جی ہار دیں   عشق بازی سیکھئے اغیار سے

میر :- کیونکر نہ ہو تم میر کے آزار کے درپے   یہ جرم ہے اس کا کہ تمھیں پیار کرے ہے
یاں شہر حسن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں   کیا جانئے کہ مہر و وفا ہو کہاں کی بات
یاں مہر تھی وفا تھی، واں جور تھے ستم تھے   پھر نکلے بھی تو میرے ہی یہ گناہ نکلے
حال بد گفتنی نہیں میرا   تم نے پوچھا تو مہربانی کی

غالب :- یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے،   ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی   بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہئے کہ ہاں کیوں ہو
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی   تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے؟
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم   میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے،
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو   کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں

مومن کے اکثر طنزیہ اشعار کا ایک نقص یہ ہے کہ انھوں نے "حسب عادت" ان میں لایعنی مضامین باندھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا ذوق ان لایعنی مضامین سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو وہ ان اشعار کے طنزیہ پہلو سے کیونکر لطف اندوز ہو سکیں گے۔ مثلاً ؎

غیر عیادت سے برا مانتے   قتل کیا آن کے اچھا کیا
دیکھ مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر   یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں،
مٹی نہ دی مزار تلک آ کے اس پہ بھی   کہتے ہیں لوگ خاک میں اس نے ملا دیا

مومن کے کلام میں خمریاتی اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور اگر اس خصوصیت کو بھی اُن کے امتیازات میں شمار کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لیکن اس باب میں جناب معجز سہسوانی کا یہ کہنا کہ مومن نے "غزل کا دامن مضامین شراب سے آلودہ نہ ہونے دیا اور جہاں کہیں بضرورت قافیہ ذکر کیا ہے وہاں اپنی ذات کو بادہ نوشی سے محفوظ رکھا ہے اور اس طرح بچایا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے" نہ صرف مبالغہ آمیز ہے بلکہ مضحکہ خیز اور تبسم انگیز بھی۔ اول تو خمریاتی اشعار میں اپنی ذات کو بادہ نوشی سے محفوظ رکھنا یا دکھانا کوئی ایسی لائق تعریف بات نہیں جس کو اجاگر کرنا اور جس کی داد دینا ضروری ہو، لیکن اگر ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے قابلِ ستائش مان لیں جب بھی مومن داد کے مستحق اس لئے نہیں کہ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے آپ کو رند و بادہ خوار کی حیثیت سے پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

مجھ سے میکش کی طرف محتسب آتا ہے تو آئے   ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں
پس شکستن خم، زجر محتسب معقول،   گناہ گار نے سمجھا گناہ گار مجھے،

مومن کے بعض نقادوں نے جہاں اور بہت سی دلچسپ اور بصیرت افروز باتیں کہی ہیں وہاں اُردو شعرا میں میر، غالب اور جرأت سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اور اس قدر انصاف کے ساتھ ہر ایک کے مقابلہ میں مومن ہی کو بہتر اور برتر دکھایا گیا ہے سب سے پہلے جرأت اور مومن کا "ٹکراؤ" دیکھئے۔ ان دونوں کے موازنہ کی بنیاد معاملہ بندی ہے جسے وقوعہ گوئی بھی کہتے ہیں۔ اس باب میں جرأت کی عریاں نگاری اور مومن کی متانت و سنجیدگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ پروفیسر ضیا تذکرہ جلوۂ خضر کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جرأت بہ سبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے۔ اس کے برخلاف مومن نے ہر جگہ دہلی کی متانت کو نبایا ہے اور دائرۂ تہذیب میں رہ کر جذباتِ عشق کو ادا کیا ہے" یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب جرأت کے یہاں بھی سنجیدہ معاملہ بندی اور مومن کے یہاں بھی مبتذل وقوعہ گوئی کی مثالیں دال میں نمک کے برابر نہیں بلکہ خاصی تعداد میں موجود ہیں تو پھر ان دونوں کا موازنہ کرتے وقت اول الذکر کی عریانی اور موخر الذکر کی متانت کو کیوں نمایاں کیا جاتا ہے۔ کیا نقد صحیح کا تقاضہ یہی ہے کہ جب دو شاعروں کا موازنہ کیا جائے تو ایک کے صرف بلند کلام کو سامنے رکھا جائے اور دوسرے کے صرف پست کلام کو؟ دیانتداری کا اقتضا تو یہ تھا کہ معاملہ بندی میں جرأت و مومن کے صرف متین و شایستہ کلام کا موازنہ کر کے دونوں کے فرق کو واضح اور مرتبے کو متعین کیا جاتا لیکن پروفیسر ضیا صرف یہ کہہ کر الگ ہو رہے کہ جرأت دائرۂ تہذیب سے متجاوز ہو گئے اور مومن نے دہلی کی متانت کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایک جگہ اسی قسم کی "تنقیدی سیاست" کو اپناتے ہوئے نیاز فتحپوری لکھتے ہیں :۔ "مومن کا محبوب بھی جرأت و انشا کی طرح بازاری ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جرأت و انشا کا عشق بھی بازاری ہے اور مومن بہت بلندی سے دیکھتے ہیں اور اسی بلند فضا تک محبوب کو بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ جرأت و انشا، اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لئے بھی آمادہ

ہوجاتے ہیں لیکن مومن کی پاکیزگیِ ذوق کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی امید کو بھی اس عالمِ آب و گل سے جدا قرار دے کر ایک غیر فانی چیز بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی محبت کی فضا محبوب و جلوۂ محبوب سے بھی بے نیاز ہوجاتی ہے چنانچہ کہتا ہے :-

قطع امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت
مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں

میں یہاں اشعار کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن جہاں تک جرأت کا تعلق ہے اگر ان کی شاعری کے عامیانہ حصے سے قطع نظر کر لیجئے تو پھر نہ تو اس کا محبوب ہی بازاری ہے اور نہ ان کی محبت ہی سوقیانہ ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ اگر جرأت کا محبوب سرتاسر بازاری ہوتا تو ان کے یہاں اس قسم کے اشعار نہ ملتے ؎

کوچۂ جاناں سے جاتے ہیں پہ جا سکتے نہیں
گو اُٹھاتے ہیں قدم پر دل اُٹھا سکتے نہیں
کیا ہوئے وہ دن جو یہ پیغام آتے تھے ہمیں
اب تو دردِ ہجر کی ایذا اُٹھا سکتے نہیں،
صورت اپنی تم کسی صورت دکھا جاؤ ہمیں
ہیں پرائے بس میں ہم لاچار آسکتے نہیں
وہ سوزِ دل سے بھر لاتا تھا اشکِ سرخ آنکھوں میں
اگر ہم جی کی بے چینی سے آہ سرد بھرتے تھے
سُنا ہے وہ خدا ناکردہ ہے بیمار کیا کیجئے،
عیادت کو بھی جانا ہے ہمیں دشوار کیا کیجئے

اور اگر جرأت کا عشق بازاری ہوتا تو وہ اس قسم کے دل گداز اشعار ہرگز نہ کہہ پاتے ؎

ترے بِن دیکھے جرأت کی یہ حالت ہوگئی غم سے
کہ اپنے سے تو اس کو بھر نظر دیکھا نہیں جاتا
دیکھ اس گل کو جو شعلہ سا جگر سے چمکا
کیا مرا داغِ کہن پھر نئے سر سے چمکا
آج کیا جانے کیا ہوا ہم کو
کل تک ایسا تو جی نڈھال نہ تھا
کریں حال قصد کیونکر اضطرابِ دل جتانے کا
کسی صورت نہ ہو مقدور جس جا لب ہلانے کا
کیا کہیں وصل ہوئے پھر بھی زباں سے اپنے
حرفِ مطلب نہ کوئی منھ سے ہمارے نکلا
روئے ہے بات بات پر جرأت
ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں
بھلا دیکھو تو ہم تم ایک ہی بستی میں بستے ہیں
سو تس پر یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں
سختیاں دردِ محبت کی نہ پوچھو ہے ہے
جی ہی جانے ہے جو کچھ دل نے اذیت پائی
یہ نہ کہ یاد آئی کس کی جو کلیجے پر مرے
سانس کے لینے میں اک برچھی سی لگ جاتی لگی

اختصار کی غرض سے اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ اس قسم کے تیر و نشتر جرأت کے یہاں بہت ہیں اور ایسا تو نہیں ہے کہ جرأت کے یہ اور اسی قسم کے دوسرے اشعار نیاز صاحب کی نظر سے نہیں گزرے لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کی مومن پرستی جرأت کے ساتھ انصاف کرنے کی روادار تھی ہی نہیں اور اسی لئے جرأت کے صرف عامیانہ اشعار کو سامنے رکھ کر جتنی پست رائے قایم کی جا سکتی تھی وہ اس کا اظہار کر گئے اور اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ جن تیروں سے وہ جرأت کو مجروح کر رہے ہیں انکا نشانہ مومن کو بھی بنایا جا سکتا ہے مثلاً انھوں نے مومن کی پاکیزگیِ ذوق کا جو قصیدہ لکھا ہے اُس کی تشبیب میں یہ فرما گئے کہ "جرأت و انشا اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترکِ محبت کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں" لیکن کیا اس جرم کے گنہگار مومن نہیں ہیں ؟ آخر نیاز صاحب مومن کا یہ شعر کیوں بھول گئے ؎

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

جرأت کا پست کلام بغایت پست سہی لیکن جہاں انھوں نے صحیح اور پاکیزہ رنگ کی شاعری کی ہے وہاں جذبات کی متانت، شاعرانہ بلندی، تجربات کے خلوص اور واقعیت۔ اور انداز بیان کی روانی، سلاست اور حلاوت کے اعتبار سے وہ کہیں کہیں مومن کے ہمسر اور اکثر بڑھ [illegible] علاوہ ازیں جرأت کے یہاں فلسفیانہ شاعری کے بھی بعض پُرکیف نمونے ملتے ہیں اور یہ وہ عنصر ہے جس سے مومن کا کلام بالکل خالی ہے۔ (باقی) نظیر صدیقی

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماہ جولائی)

سمیری رسم خط عراق کی سمیری قوم کا عروج تقریباً ۵۰۰ سال (۲۵۰۰ قبل مسیح سے ۲۰۰۰ قبل مسیح تک) رہا۔ یہ قوم کہاں سے ہجرت کرکے عراق آئی اور نسلی و لسانی اعتبار سے اس کا تعلق کس گروہ سے تھا، اس کی پوری تحقیق ابھی تک نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی زبان قدیم ترکی، منگولی اور دراوڑی سے ملتی جلتی تھی۔

ان کا رسم خط تصویری تھا۔ اس میں تقریباً دو ہزار نقوش و تصاویر سے کام لیا جاتا تھا، جن کی دو قسمیں تھیں، سادہ تصاویر (PICTOGRAMS) اور تصاویر خیالی (IDEOGRAMS) قسم اول میں ہر تصویر سے وہی چیز مراد لی جاتی ہے جس کی تصویر ہوتی تھی جیسے:-

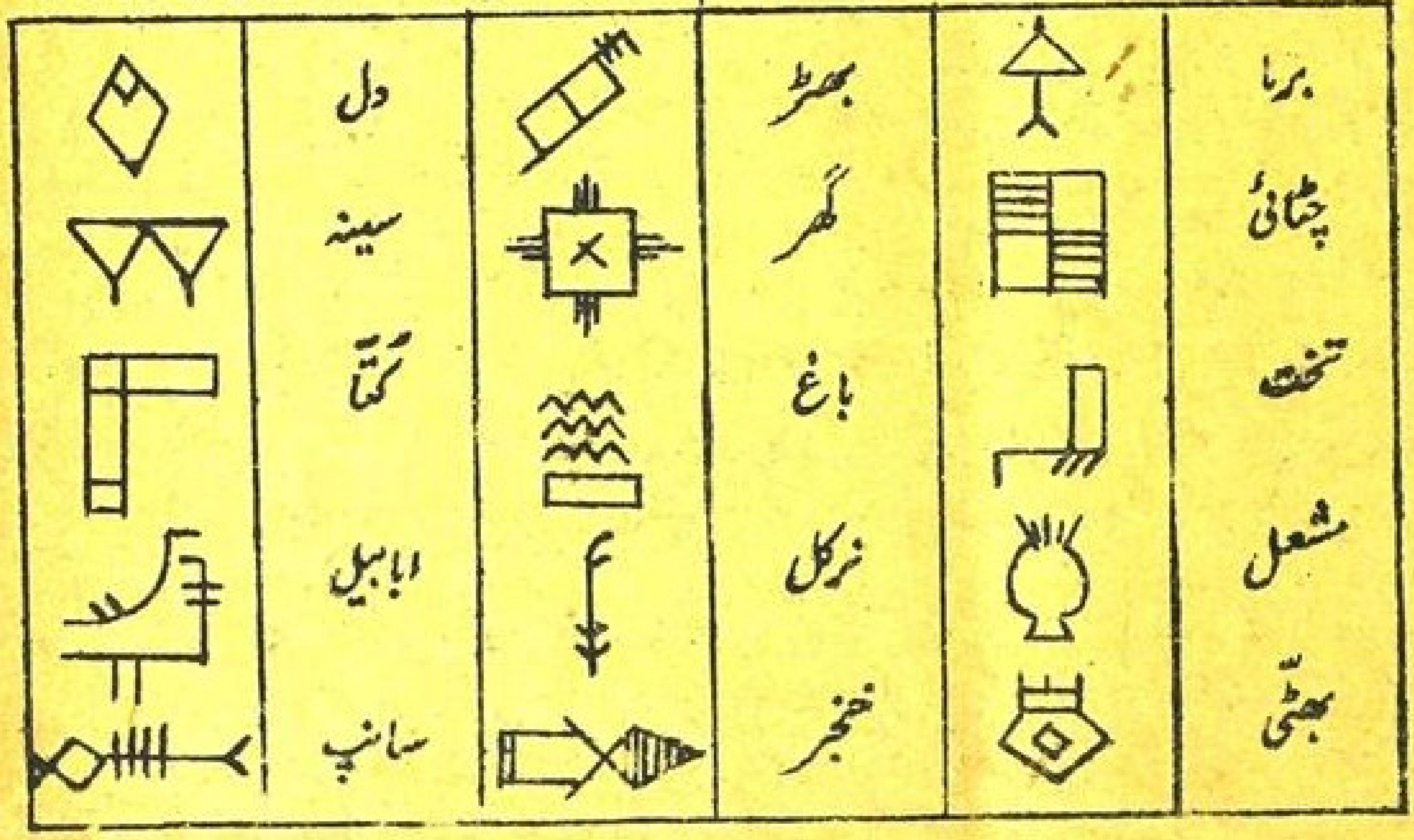
برما
بھیڑ
دل
چٹائی
گھر
سینہ
تخت
باغ
کتا
مشعل
نرکل
ابابیل
بھٹی
خنجر
سانپ

قسم دوم میں دور کے معنی مراد ہوتے تھے، جیسے سورج بنا کر دن یا وقت اور پاؤں بنا کر چلنا یا کھڑا ہونا۔ بعض خیالات کا اظہار مرکب تصاویر سے بھی کیا جاتا تھا۔ مثلاً:

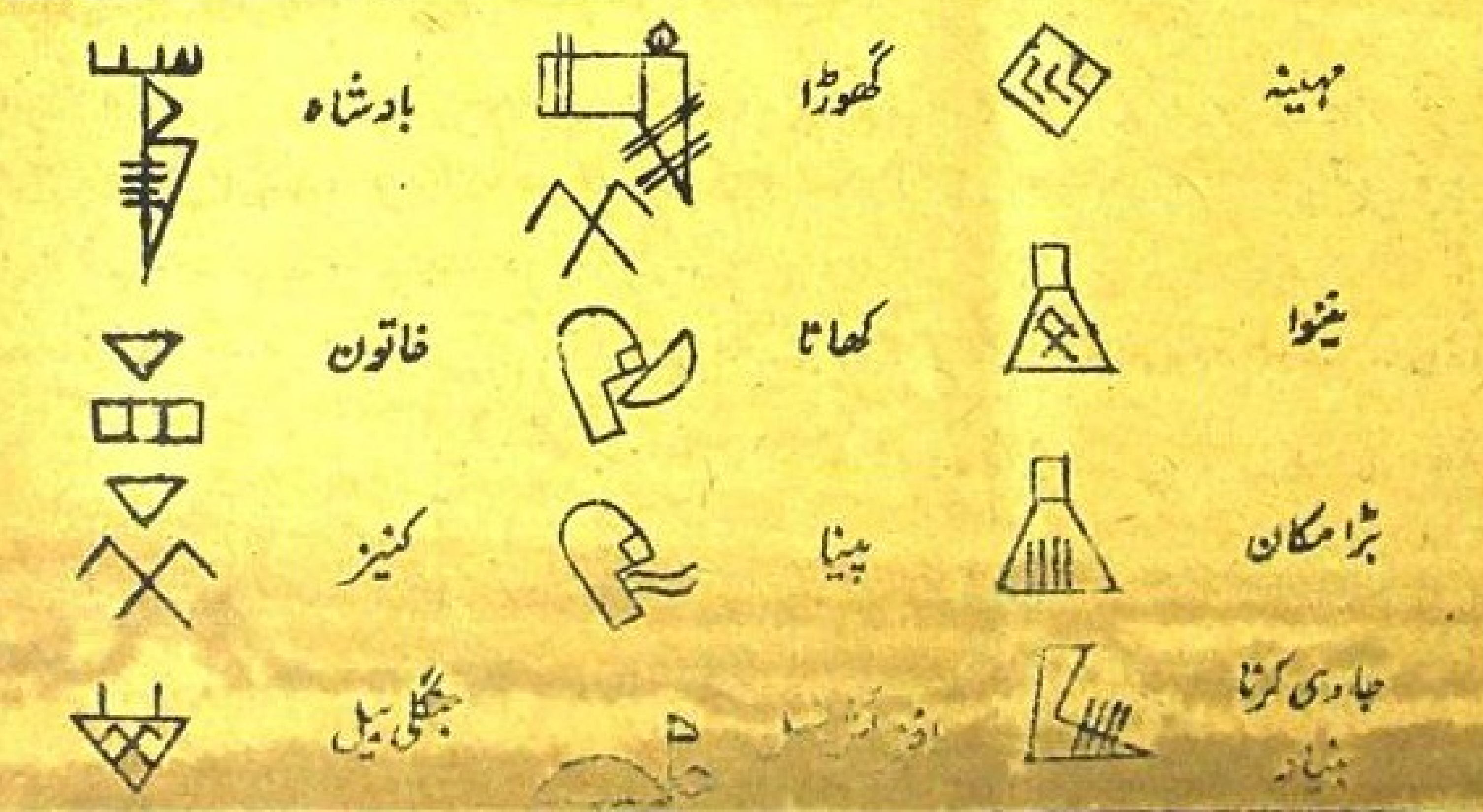
مہینہ
گھوڑا
بادشاہ
نینوا
کھانا
خاتون
بڑا مکان
پینا
کنیز
جاری کرنا
جنگلی بیل

بادشاہ کے لئے آدمی اور تاج کی تصویر اور خاتون کے لئے عورت اور لباس کی (عورت کے لئے پوری تصویر بنانے کی جگہ اُس کے مخصوص عضو کا بنانا کافی سمجھا جاتا تھا) اسی طرح کنیز کے لئے عورت اور پہاڑ کی تصویر بنائی جاتی تھی (شاید اس لئے کہ اُس زمانہ میں پہاڑی عورتوں کو گرفتار کرکے لونڈیاں بنالیا جاتا تھا)۔

بیل کے چہرے کے اندر پہاڑ کا نشان بناکر جنگلی بیل مراد لیا جاتا تھا۔ گھوڑے کے لئے یہ لوگ گدھے (آنشو) اور پہاڑ (کُر) کی تصویر بناتے تھے کیونکہ ان کی زبان میں گھوڑے کو "پہاڑی گدھا" (آنشوکُر) کہتے تھے۔

کھانے کے لئے یہ لوگ آدمی کا چہرہ بناکر اُس کے منہ سے پیالہ لگادیتے اور پینا لکھنے کے لئے حلق کے پاس پانی کی لہر بنادیتے، افزائشِ نسل کے لئے بطخ اور انڈے کی تصویر بنائی جاتی تھی (گویا انسان کا اولاد پیدا کرنا ان کے نزدیک بطخ کے انڈے کے تھا۔

سورج کو دن کی علامت مانا جاتا تھا جس میں تیس کا ہندسہ لکھ کر مہینہ مراد لیا جاتا تھا۔ سُمیر کے شمال میں ایک شہر نینوا تھا جو آگے چل کر اشوری قوم کا دارالحکومت ہوا۔ اُس کے لئے سمیری رسم خط میں مکان اور مچھلی کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ شہر ماہی گیروں کی بستی تھا۔

کسی لفظ میں عظمت یا کثرت کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے اصل نشان میں چار لکیروں کا اضافہ کردیا جاتا جیسے اگر مکان کی تصویر بناکر اُس میں چار لکیریں (کھڑی یا آڑی) کھینچ دی جاتیں تو اس کے معنی بڑا مکان ہوجاتے۔ پاؤں کھڑا ہونے اور چلنے کی علامت تھا۔ اگر اُس میں چار لکیریں بڑھادی جاتیں تو اُس کے معنی جلدی کرنے کے ہوجاتے۔

ان کو سمیری زبان میں گُوگُو والے نشانات کہتے تھے۔ گُوگُو کے معنی ان کی زبان میں بڑھانے یا اضافہ کرنے کے تھے (ہوسکتا ہے کہ ہماری زبان میں لفظ گُنا (جیسے دوگنا، چوگنا) سمیری زبان ہی سے آیا ہو)

۱- تصویری الفاظ (WORD SIGNS) سمیری رسم خط میں نشانات کو پڑھا نہیں جاتا تھا بلکہ دیکھا اور سمجھا جاتا تھا پھر یہ تصویریں جن خیالات کو ظاہر کرتی تھیں اُن سے متعلق الفاظ استعمال کئے جانے لگے۔ مثلاً ستارے کو وہ "اَن" کہتے تھے اور بعد کو ستارے کا نشان ہی آواز "اَن" کا مظہر قرار پایا۔ پھر چونکہ ایک ہی نشان سے مختلف خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ لہذا ایک ہی نشان کئی کئی آوازوں کے لئے استعمال ہونے لگا، ایسے نشانات کو (POLY PHONES) کہتے ہیں۔ مثلاً سمیری رسم خط میں انسان کا چہرہ 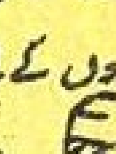 چار چیزوں کو ظاہر کرتا تھا:- چہرہ، بولنا، چلّانا، لفظ اور اس طرح یہ چار آوازوں کا (دُگ، گگ اور انیم) کا حامل تھا۔

اس کے علاوہ ایک دوسری صورت اور تھی جس میں بعض خیالات کو ایک سے زاید طریقوں سے (بذریعۂ تصاویر) ظاہر کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی آواز کے بہت سے نشانات بن گئے تھے جنھیں (HOMO PHONES) کہتے ہیں۔

۲- تصویری کلمات (SYLLABIC SIGNS) بعض صورتوں میں تصویروں کے معنی نظرانداز کردئے جاتے ہیں اور صرف آوازیں لی جاتی ہیں۔ ایسی دو تین آوازوں کے ملانے سے جو مرکب آواز تیار ہوتی ہے وہ عموماً اُن کی زبان کا کوئی ایسا لفظ ہوتا ہے جس کی تصویر نہیں بنائی جاسکتی۔ یہ آوازیں یک رُکنی (MONO SYLLABIC) ہوتی ہیں کیونکہ سمیری زبان کا ہر لفظ ایک کلمہ مفرد (MONO SYLLABLE) ہوا کرتا تھا۔

۳- مفہوم متعین کرنے والی تصاویر (DETERMINATIVES) بعض تصاویر الفاظ کا متعین کرنے کے لئے بنائی جاتیں۔ مثلاً:-

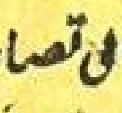 دیوتا کا نام

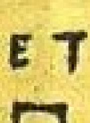 لباس کا نام

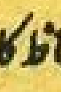 مقام کا نام

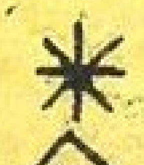 مہینہ کا نام

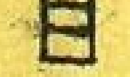 لکڑی یا درخت کا نام

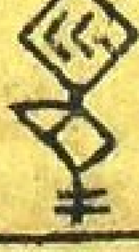 ہوا کا نام

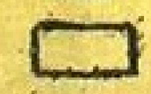 درخت پہاڑ یا ملک کا نام

تغیرات۔ تقریباً ۳۰۰۰ ق۔م سمیری رسم خط میں ایک زبردست انقلاب ہوا یعنی پہلے وہ چینی رسم خط کی طرح اوپر سے نیچے کو کھڑے خانوں میں لکھا جاتا تھا (لکھنا دائیں طرف سے شروع کرتے تھے) لیکن بعد کو بائیں سے دائیں کی طرف آڑے خانوں میں لکھا جانے لگا۔ یہ غالباً لکھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ چونکہ بعض نشانات ایسے تھے جو کھڑا لکھنے پر خانے سے باہر ہو جاتے اس لئے انھوں نے خانوں کو افقی صورت دیکر بائیں طرف سے لکھنا شروع کیا جس کی وضاحت ذیل کے نقشے سے ہو سکتی ہے:۔

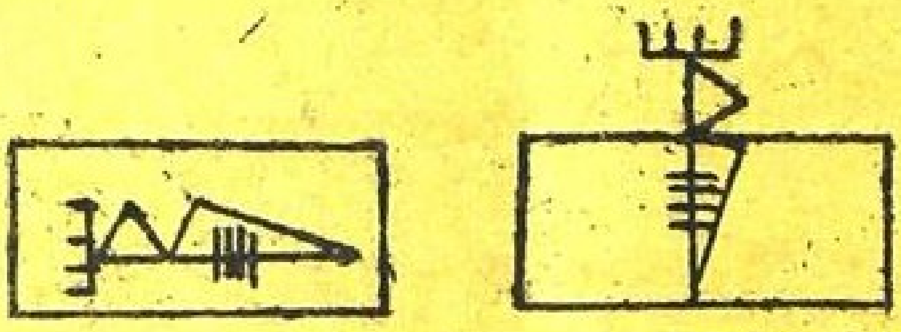

عام طور سے سمیری رسم خط صاف کی ہوئی چکنی مٹی کی تختیوں پر لکھا جاتا تھا جنھیں لکھ کر دھوپ میں سکھا لیتے تھے۔ ضروری اور اہم تختیوں کو بھٹیوں میں پکا لیا جاتا تھا۔

پرانے کتبات کی لکھائی بڑی بھدی تھی اس عیب کو دور کرنے کے لئے بخت نصر کے زمانے سے کوشش شروع کی گئی۔ چونکہ مٹی پر قوسین اور گولائیوں کا بنانا مشکل ہوتا ہے اور لکیروں کو کھینچنا نسبتاً آسان۔ اس لئے نشانات کو باقاعدہ بنانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نشان لکیروں کا مجموعہ معلوم ہونے لگا۔ اس بناء پر اس لکھائی کو (LINEAR SCRIPT) کہتے ہیں۔

اس کے بعد ایک دوسری تبدیلی ہوئی۔ سمیری کاتبوں نے لکھنے میں مزید سہولت پیدا کرنے کے لئے ایک خاص طرح کے قلم استعمال کرنا شروع کئے جن کے سرے کو مٹی پر دبانے سے میخ یا پیکان کا نشان بنتا تھا۔ یہ میخیں تین ناپ کی ہوتی تھیں، بڑی، چھوٹی اور چوڑی۔ چھوٹی بڑی کی نصف ہوتی تھی، ایسی دو میخوں کو نوک کی طرف سے ملا سکتے تھے یا موٹے سرے کی طرف سے۔ تیسری میخ اتنی چوڑی ہوتی تھی کہ اس پر چھوٹی والی تین میخیں کھڑی کی جا سکتی تھیں اور اس کی اونچائی بڑی کی نصف ہوتی تھی۔

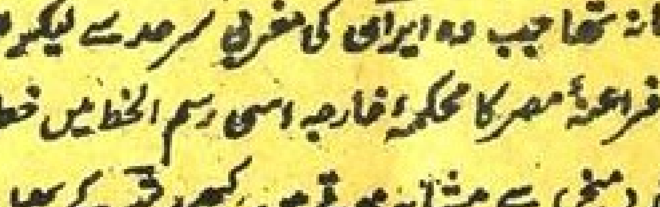

اور ابتدائی میخی رسم خط کی۔

میخی رسم خط

دنیا کے رسوم خط میں میخی رسم الخط کی تاریخ بہت طویل ہے اس کا استعمال سن عیسوی کے آغاز تک جاری رہا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ ایران کی مغربی سرحد سے لیکر ایشیائے کوچک تک مستعمل تھا اور اس نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی تھی، حتیٰ کہ فراعنۂ مصر کا محکمۂ خارجہ اسی رسم الخط میں خط و کتابت کرتا تھا۔

اس رسم الخط کے نشانات کبھی کھونٹی (میخ) سے مشابہ ہوتے ہیں، کبھی تیر کے پھل (پیکان) اور کبھی کیل (مسمار) سے۔ اسی لئے اسے میخی، پیکانی اور مسماری کا نام دیا جاتا ہے۔ آخری نام عربی میں مستعمل ہے۔

انگریزی میں اس کا نام (CUNEIFORM) ہے جو لاطینی الفاظ (CUNEUS) "میخ" اور (FORMA) "شکل" سے مرکب ہے۔ یہ نام پہلے پہل ۱۷۰۰ء میں مسٹر ٹامس ہائیڈ نے استعمال کیا تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں عبرانی کے پروفیسر تھے۔

بعد کو اکاد، بابل اور آشوریہ کی سامی اقوام نے بھی تھوڑے سے تغیر کے ساتھ میخی رسم خط استعمال کیا۔ اس تبدیلی کی کیفیت

آپ کو ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا۔

	آشوری	بابلی	سمیری
سورج	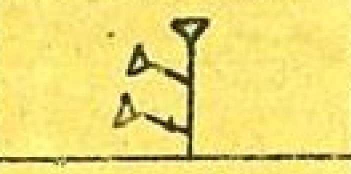	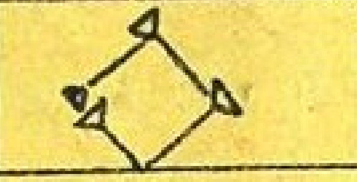	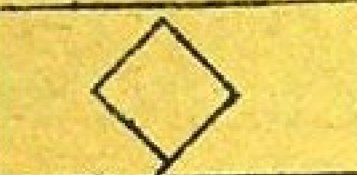
ستارہ	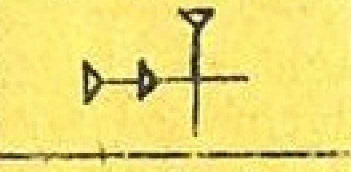	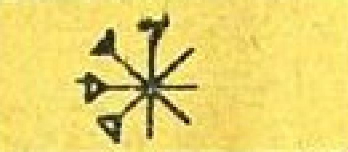	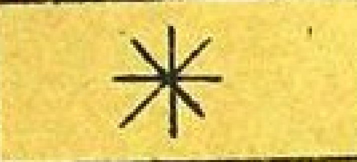
آدمی	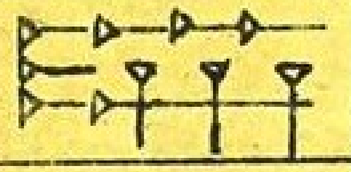	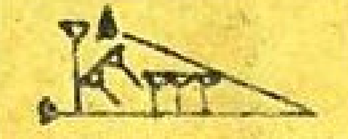	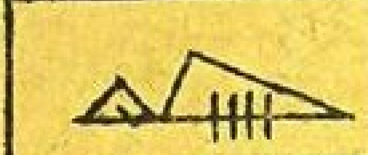
سر	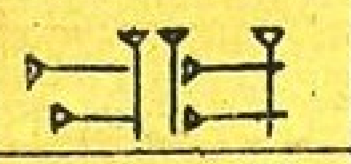	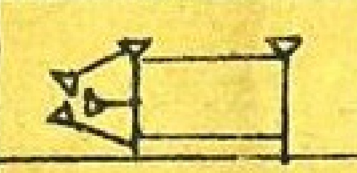	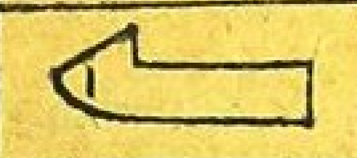
پیر	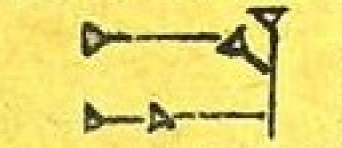	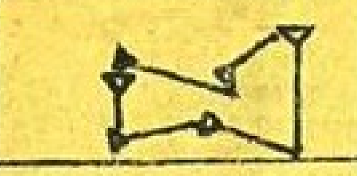	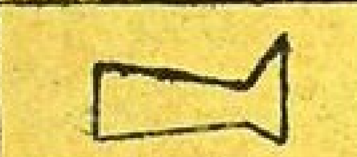
چڑیا	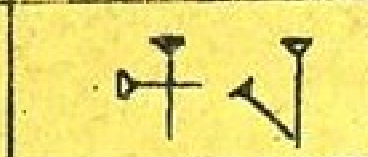	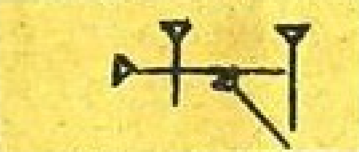	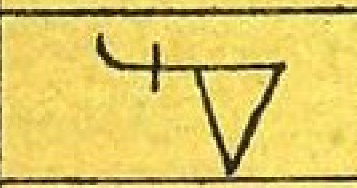
مچھلی	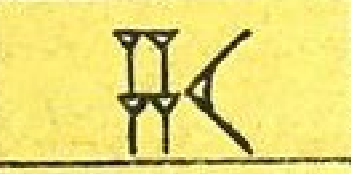	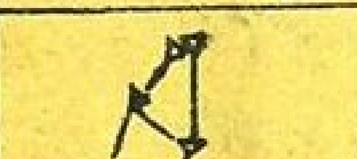	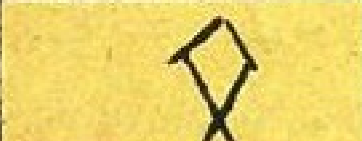
بیل	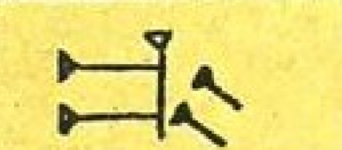	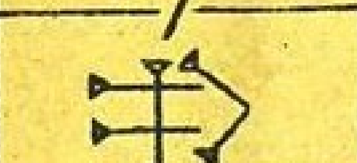	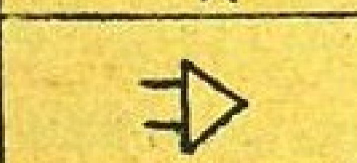
ہل	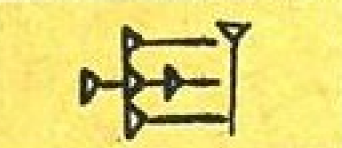	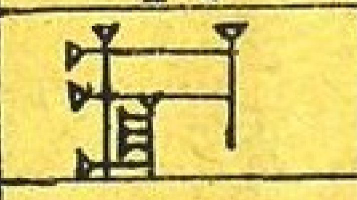	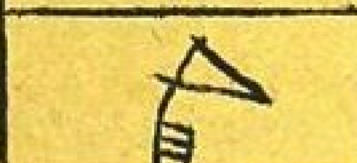
جو	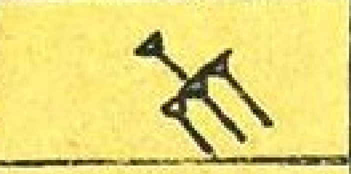	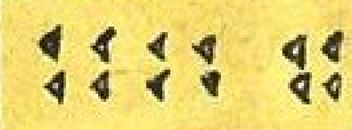	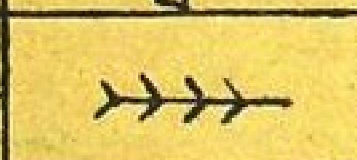
پانی	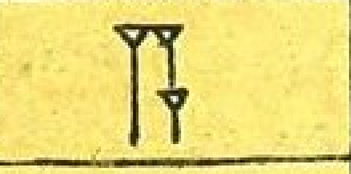	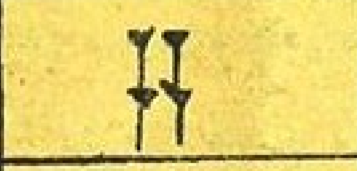	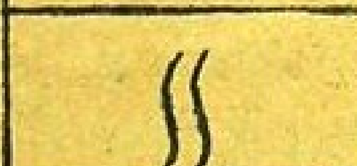
پیالہ	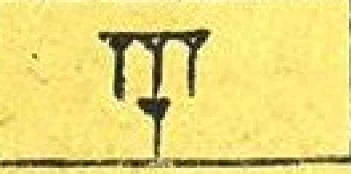	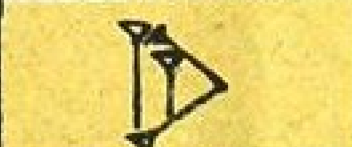	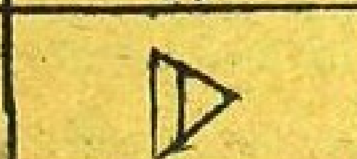

اکادی رسم خط

عراق کے شمالی حصّہ کو اکاد کہتے تھے جہاں سامی قوم آباد تھی۔ اس قوم نے سمیری رسم الخط ۳۰۰۰ ق۔م کے کچھ زمانہ بعد اختیار کیا اور ۲۵۰۰ ق۔م سے اُن میں اس کا رواج عام ہوگیا۔ چنانچہ سامی قوم کے مشہور حکمراں سارگون اول (زمانہ ۲۵۰۰ ق۔م) کا ایک کتبہ سنگ سماق پر اسی رسم خط میں برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

اکادیوں نے سمیری رسم خط کی تصویروں کے نام اپنی زبان میں علیحدہ رکھے اور ساتھ ہی ساتھ سمیری نام بھی رہنے دئے اس سے نشانات کی آوازیں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ ورنہ سمیری اور اکادی رسم خط میں بظاہر کوئی فرق نہیں ہے۔ اکادیوں کے زمانہ تک سمیری رسم خط

(LINEAR SCRIPT) میں بدل چکا تھا۔ چنانچہ سارگون کا کتبہ اسی لکھائی میں ہے۔ نیچے اکادی رسم خط کا ایک پرانا کتبہ اور اُس کی نقل پیکانی حروف میں درج کی جاتی ہے۔ یہ دو اینٹوں سے ماخوذ ہیں جو ہنری رالنسن کو ورکہ (قدیم اُرک یا ایریخ) کے کھنڈروں میں ملی تھیں۔

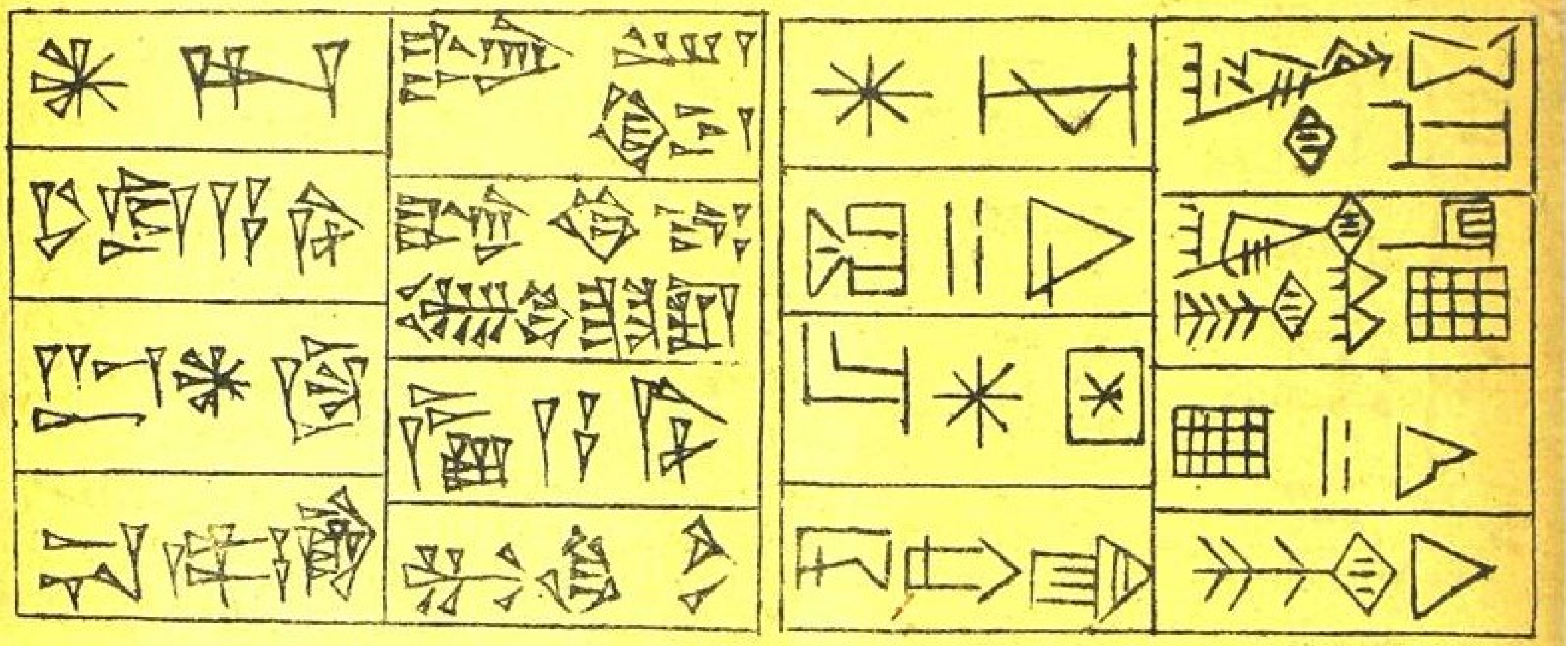

اکادی رسم خط کا کتبہ

ترجمہ۔ اُرخ، مقدس سردار، سُمر کے بادشاہ اور اکاد کے ملک کے بادشاہ سے بلیقس، اُس کی مالکہ نے اپنے لئے ایک مندر بنوایا۔

بابلی رسم خط

شاہانِ اکاد کے زوال کے بعد حکومت بابل[1] نے عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ اُس کا پہلا بادشاہ حمورابی (۱۹۰۰ء ق م) تھا۔ اُس کی حکومت رفتہ رفتہ اکاد کی پوری مملکت پر پھیل گئی اور اُس کا نام بجائے اکاد کے بابل پڑ گیا۔

بابل والے زبان اور نسل کے اعتبار سے اکاد والوں سے مختلف نہیں تھے۔ حمورابی سے پہلے کی زبان و قوم اکادی کہلاتی تھی اور بعد کی بابلی۔ ان کا رسم خط اکادیوں سے مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان لوگوں نے میخوں کی ترتیب میں کچھ تبدیلی کر دی تھی اور بعض نشانات کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ پھر بھی ان کے رسم خط میں ۶۰۰ سے زیادہ نشانات کام آتے تھے۔ دور آخر میں ایسے نشانات بہت مختصر ہو گئے تھے۔

بابلی رسم خط کا نمونہ یہ ہے:-

سمیری اور اکادی رسم خط کی طرح اسے بھی بائیں سے دائیں کو پڑھا جائے گا۔ یہ شاہِ بابل بنی اُم کُدری اُسُرا۔ (متوفی ۵۶۱ ق۔م) کا نام ہے جسے عام طور سے بخت نصر کہتے ہیں۔ یہ[2] اس بات کی علامت ہے کہ اس کے بعد کوئی مقدس نام ہے اور یہ[3] اس بات کی کہ اس کے پہلے کسی جگہ کا نام ہے۔

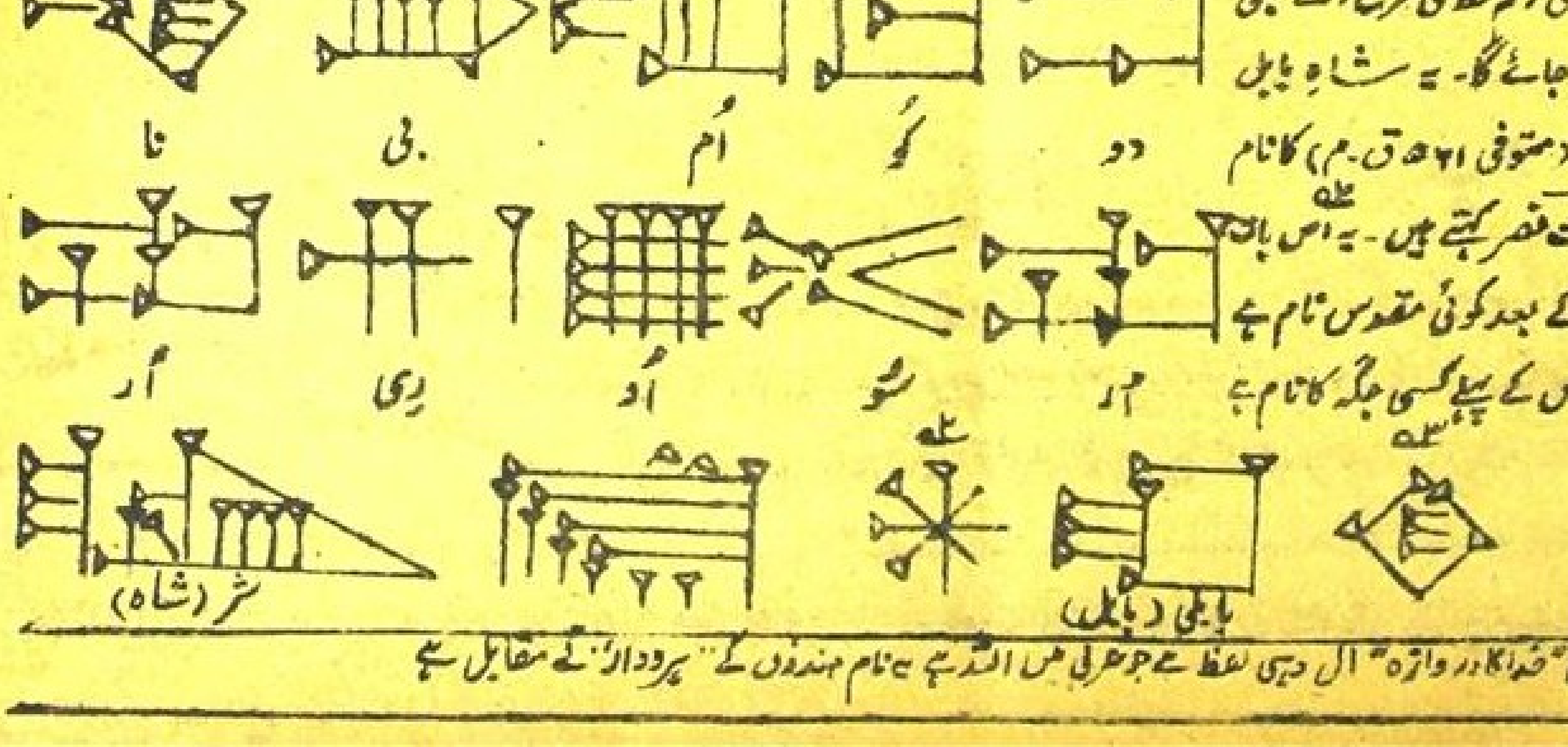

---

[1] بابل کے لفظی معنی ہیں "خدا کا دروازہ" ال دیبی لفظ ہے جو عربی میں اللہ ہے یہ نام ہندوں کے "پرودار" کے مقابل ہے

آشوری رسم خط

وادیِ دجلہ و فرات کا شمالی حصہ آشوریہ یا اسیریا کہلاتا تھا۔ یہ نام اُن کے مشہور شہر آشور سے ماخوذ ہے۔ خود اس شہر کا نام اُن کے دیوتا کے نام پر رکھا گیا تھا۔

آشوریہ میں سمیری رسم خط کا رواج بابل والوں کے بعد تقریباً ۲۳۰۰ ق۔م ہوا۔ بابل اور آشوریہ والے سامی النسل تھے۔ دونوں نے سمیری نشانات کے نام سامی زبان میں رکھے۔ آشوریہ والوں نے بابلی رسم خط میں کچھ تبدیلیاں کیں، یعنی نشانات کو چوکور بنانے کی کوشش کی، پیکانی نشانات کو کچھ گھٹا دیا، انکی ترتیب میں فرق کر دیا، اور بہت نشانات کا استعمال چھوڑ دیا۔ آشوری رسم خط میں کام آنے والے نشانات کی تعداد کل ۵۷۰ تھی جن میں سے تقریباً ۳۰۰ عام طور سے مستعمل تھے۔ انکی پانچ قسمیں تھیں۔

۱- یک کنی اصوات[1]

یعنی حروف علت یا حروف صحیح جن کے شروع یا آخر میں حروفِ علت جُڑے رہتے تھے جیسے:-

(داہنے سے بائیں کو پڑھئے)

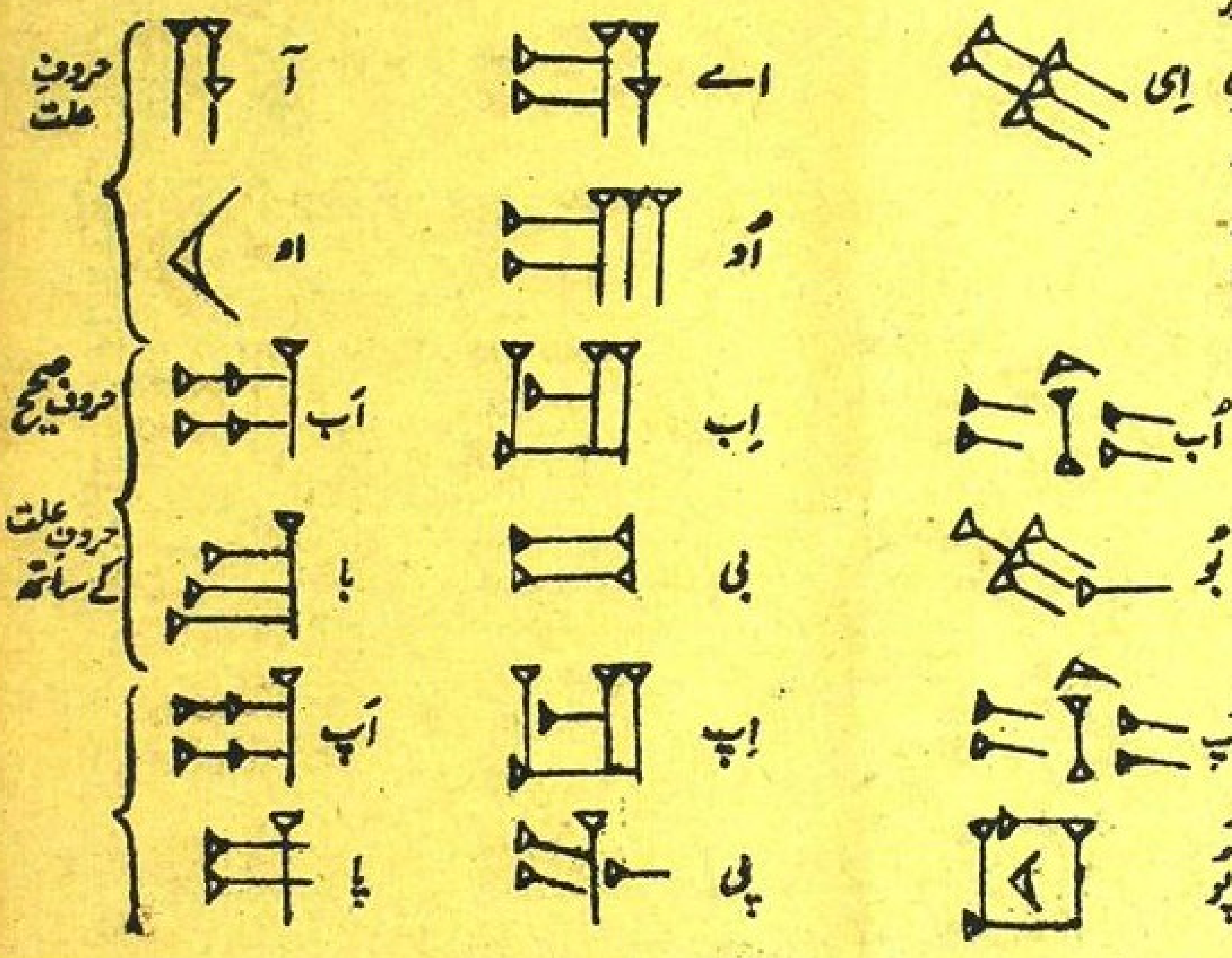

مندرجۂ بالا نشانات کے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ آشوری میں مفرد حرف ب کے لئے ایک نشان نہ تھا بلکہ چھ تھے۔ یہی حال دوسرے حروف صحیح کا تھا۔

۲- COMPOUND SYLLABLES[2] ۔ یعنی دو حروف صحیح جن کے بیچ میں ایک حرفِ علت ہوتا ہے۔ جیسے:-

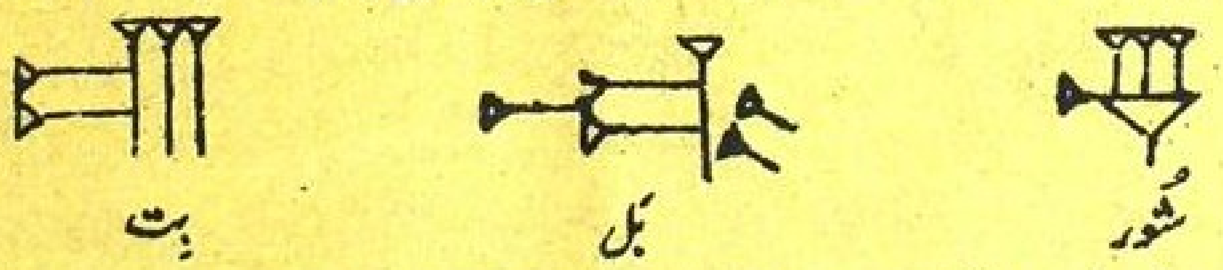

۳- پورے لفظ کا مفہوم ظاہر کرنے والے نشانات۔ (WORD SIGNS) جیسے:-

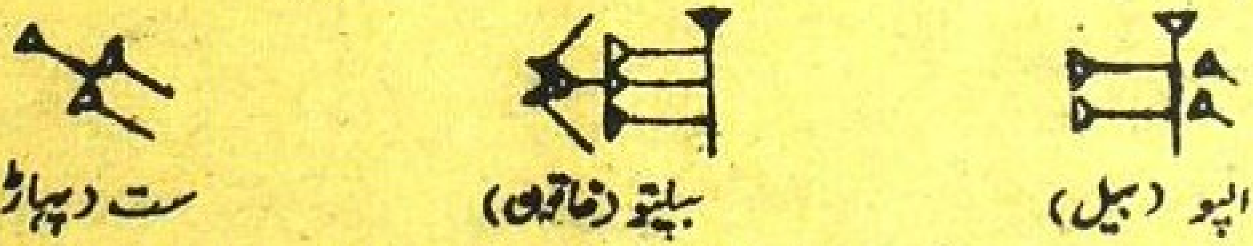

۴- نشاناتِ تعیینی (DETERMINATIVES) نمبر ۳ والے نشانات جنھیں اشارات یا علامات کے طور پر بعض ناموں کے پہلے یا بعد میں لکھا جاتا تھا، پڑھا نہیں جاتا تھا، یہ حروف اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ ان کے پاس جو لفظ آیا ہے وہ کس چیز کا نام ہے۔ دیوتا کا، مرد کا، عورت کا وغیرہ وغیرہ

---

[1] انھیں (OPEN SYLLABLES) بھی کہتے ہیں۔ [2] انھیں CLOSED SYLLABLES بھی کہتے ہیں

اس طرف دی ہوئی مثالوں سے ان کے استعمال کو آپ اچھی طرح سمجھ سکیں گے :-

اشوری رسم خط بائیں سے دائیں کو لکھا جاتا تھا۔

ان مثالوں میں پہلا نشان (ستارے کی مختصر صورت دیوتا اور تقدس کی علامت ہے اور اس بات کو متعین کرتا ہے کہ اس کے بعد دیوتا یا کسی مقدس چیز کا نام ہے۔

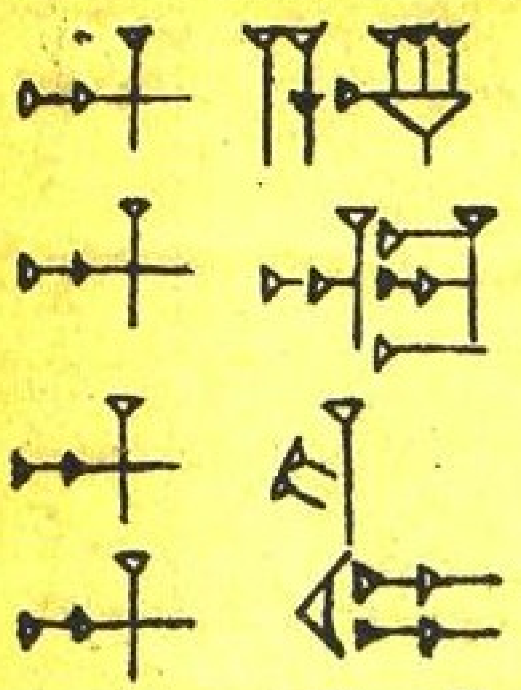
اشور (دیوتا)
نیبو (دیوتا)
سورج (دیوتا)
گرہن

آشوری رسم خط میں کام آنے والے خاص تعینی نشانات یہ ہیں :-

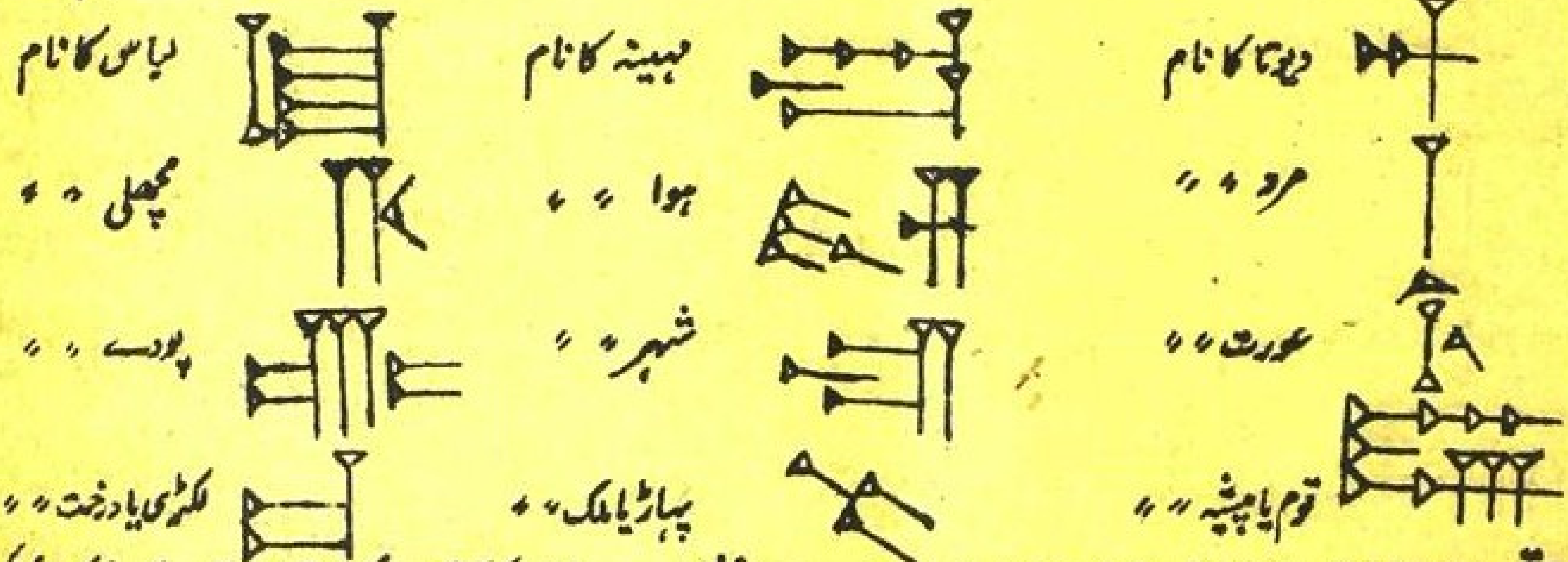
دیوتا کا نام
مہینہ کا نام
لباس کا نام
مرد " "
ہوا " "
مچھلی " "
عورت " "
شہر " "
پودے " "
قوم یا پیشہ " "
پہاڑ یا ملک " "
لکڑی یا درخت " "

۵۔ صوتی لاحقے (PHONETIC-COMPLEMENTS) وہ نشانات جو الفاظ کے آخر میں اُن کا تلفظ متعین کرنے کے لئے لکھے جاتے تھے۔ جیسے یہ نشان (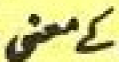) اُن کے یہاں دو معنی رکھتا تھا۔ سورج اور دن۔ جب اس کے معنی دن ہوتے تو اس کے لئے ایک جداگانہ صوتی لاحقہ استعمال کیا جاتا تھا اور جب اس کے معنے سورج کے ہوتے تو دوسرا لاحقہ لکھا جاتا۔

آخر میں آشوری رسم خط کی ایک عبارت اور اُس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ اسے بائیں سے دائیں کو پڑھئے :-

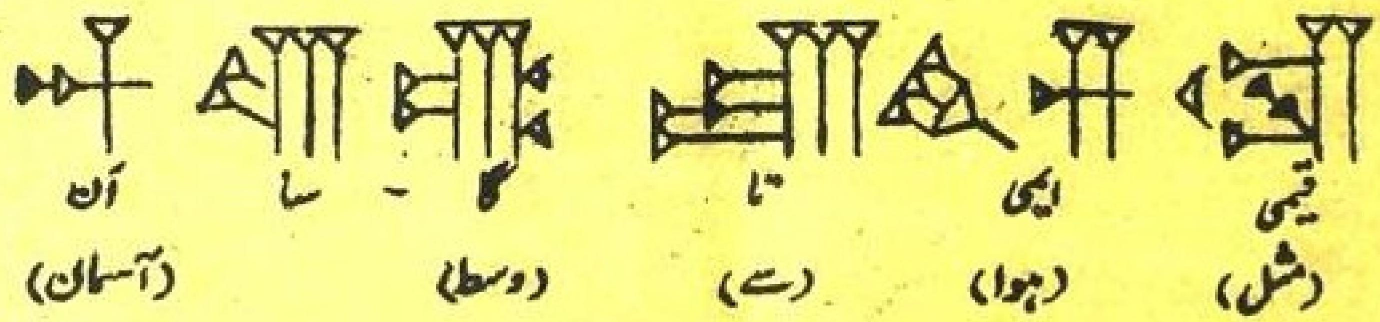
قیمی
ایمی
تا
گا - سا
ان
(مثل)
(ہوا)
(سے)
(وسط)
(آسمان)

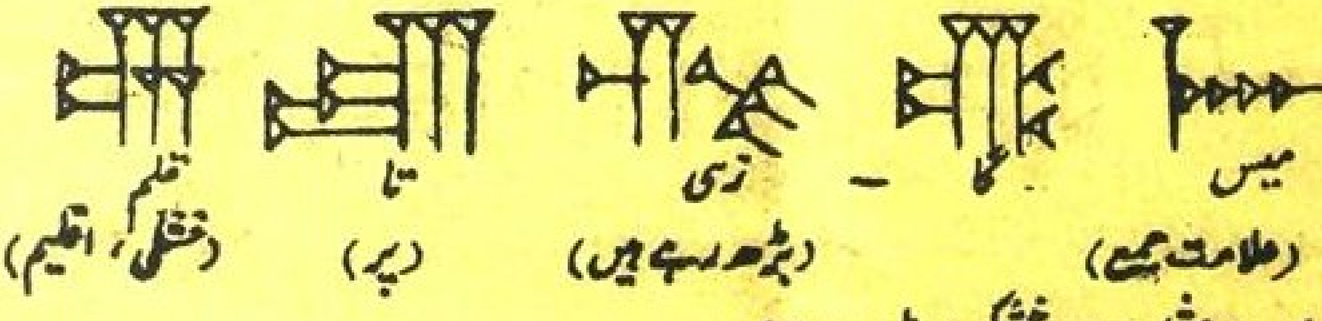
میس
گا - زی
تا
قلم
(علامت جمع)
(بڑھ رہے ہیں)
(پر)
(خشکی، اقلیم)

ترجمہ :- وسط آسمان سے مثل ہوا وہ خشکی پر بڑھ رہے ہیں۔

اب تک ہم نے جن میخی (سمیری - اکادی - بابلی - اشوری) رسم خط کا ذکر کیا ہے وہ وادیٔ دجلہ و فرات میں مستعمل تھا۔ اس کے بعد ہم ان ملکوں کا ذکر کریں گے جہاں یہ لکھائیاں قدرے ترمیم و تنسیخ کے بعد رائج تھیں۔

کیپاڈوشیا (زمانہ ۲۰۰۰ ق۔م) ۔ ترکی میں پرانے شہر قیصریہ اور دوسرے مقامات پر کھدائی کے دوران میں بہت سی پختہ تختیاں پیکانی رسم خط

کی ملی ہیں۔ یہ سب تجارتی تحریریں ہیں۔ صرف ایک کتبہ قوانین سے متعلق ہے۔ ان کے لکھنے والے سامی تاجر تھے اور ان کی زبان اور رسم خط اشوری سے مشابہ ہے۔ زمانہ تخمیناً ۲۳۰۰ ق۔م ہے۔ ملک کے جس حصے میں یہ کتبے ملے ہیں اُس کا نام پرانے زمانہ میں "کیپا ڈوشیا" تھا لہٰذا انھیں "کیپاڈوشیا کی تختیاں" کہتے ہیں۔

حطی قوم (زمانہ ۱۵۰۰ لغایت ۱۲۰۰ ق۔م)۔ ایشیائے کوچک کی سامی اقوام کے علاوہ حطی قوم (HITTITES) میں بھی پیکانی رسم خط رائج تھا۔ اُس کا دارالحکومت (BOGHAZ KEUI) تھا جو ترکی کے موجودہ دارالحکومت کے قریب ہے۔ ۱۹۰۶ء میں یہاں پر کھدائی کرتے ہوئے (DR. HUGO WINCKLER) کو پیکانی رسم خط کی بیس ہزار تختیاں ملیں۔ ان کا زمانہ ۱۵۰۰ اور ۱۲۰۰ ق۔م کے درمیان کا ہے۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں جو ہند یورپی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن میں ہندوستانی اور ایرانی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں ان کا رسم خط بابلی سے ماخوذ ہے۔

بابلی رسم خط میں بعض نشانات پورے لفظ کا مفہوم ظاہر کرتے تھے (LOGOGRAMS) اور بعض محض ارکان (SYLLABLES) الفاظ تھے۔ جب ان لوگوں نے اول الذکر نشانات لئے جیسے مچھلی کے لئے مچھلی کا نشان 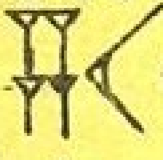 تو ان کے اختیار کرنے میں اُنھیں کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ ایسے نشانات کا زبان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

لیکن جب انھوں نے دوسری قسم کے نشانات لئے جیسے "ابو" باپ 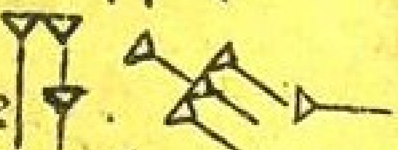 جو دو (SYLLABLES) سے مرکب ہے تو اُس کا اپنی زبان میں نام "اتش" رکھا گویا اُنھوں نے اسے (LOGOGRAM) کے طور پر اختیار کیا۔

یہ رسم خط حطی قوم میں اُس کے زوال (۱۲۰۰ ق۔م) تک مستعمل رہا اس کے علاوہ اُن میں ایک تصویری لکھائی بھی رائج تھی۔

تل الامرنہ (زمانہ چودھویں پندرھویں صدی ق۔م)۔ تل الامرنہ، مصر میں ایک مقام ہے جو امینوفس چہارم (اخیناتین) (۱۳۸۰ — ۱۳۶۲ ق۔م) کا دارالحکومت تھا۔ ۱۸۸۷ء میں یہاں ۳۲۰ مٹی کی تختیاں میخی رسم خط کی برآمد ہوئیں یہ وہ خطوط تھے جنھیں شاہانِ بابل متا اور امرائے فلسطین و شام نے امینوفس سوم[2] (۱۴۱۵ — ۱۳۸۰ ق۔م) اور امینوفس چہارم کو لکھے تھے۔ فراعنۂ مصر یا اُن کے محرروں نے ان خطوط کے جو جواب دئے اُن میں سے بھی بعض کی نقلیں ملی ہیں۔ ان کی زبان اور رسم خط بابلی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت یعنی پندرھویں چودھویں صدی ق۔م میں بابلی زبان اور رسم خط کا استعمال کتنا وسیع ہو گیا تھا۔

زاغ روس (ZAGROS) تقریباً ۱۵۰۰ اور ۱۲۰۰ ق۔م کے درمیان آشوری قوم نے اپنا رسم خط دریائے دجلہ کے مشرقی صوبوں میں بھی رائج کر دیا۔ چنانچہ عرفہ (ARRAPHA) میں یہ رسم خط عام طور سے رائج تھا۔

راس شامرہ (چودھویں صدی ق۔م)۔ ۱۹۲۹ء میں ملک شام کے ایک گاؤں راش شامرہ کے پاس (جزیرۂ قبرص کے مقابل) قدیم شہر یگارت کے آثار دریافت ہوئے جو مقامی حکمرانوں کے مقابر اور مندروں سے تعلق رکھتے ہیں، مندر کے کتب خانہ سے جو تختیاں ملیں اُن میں سے انھیں جلد پڑھ لیا گیا، جن پر فنیقی رسم خط میں کتبے تھے، لیکن اُنھیں پڑھنے میں کچھ دقت ہوئی جن پر ایک خاص قسم کے میخی حروف میں کچھ لکھا تھا۔

یہ رسم خط چودھویں صدی ق۔م مستعمل تھا۔ اس میں دو زبانیں لکھی جاتی تھیں ایک سامی جو فنیقی اور عبرانی سے مشابہ تھی اور دوسری حُرّی (HURRIAN) جو اس وقت شمالی شام اور وادیِ دجلہ و فرات کے وسیع حصوں میں بولی جاتی تھی۔

---

[1] ایک آریہ ذات جو سوریہ (سورج)، ورُن اور اندر کی پوجا کرتی تھی۔ انھوں نے ایک زمانہ میں اتنا عروج پکڑا کہ وادی دجلہ و فرات کے ایک حصہ میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ ان کا آخری بادشاہ دشرت تھا۔ جس کا نام ہمیں رامائن کے راجہ دشرت کی یاد دلاتا ہے۔

[2] یہ ملکہ نیفرتیتی کا شوہر۔ اس کا دوسرا نام "آمین ہوتیپ سوم" ہے۔

اس لکھائی میں کل ۳۲ حروف کام آتے تھے جو یہ ہیں :-

ض	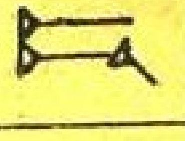	م	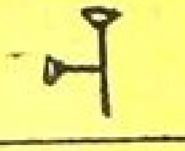	و	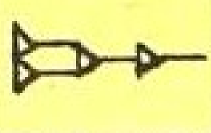	الف	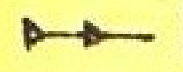
ق	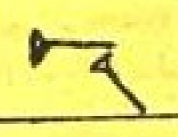	ن	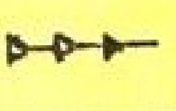	ز	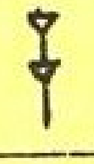	″	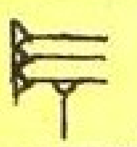
ر	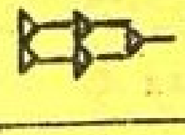	س	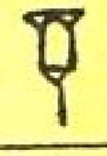	ح	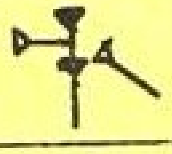	″	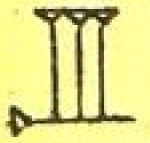
ش	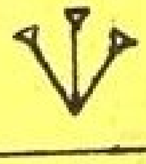	ء	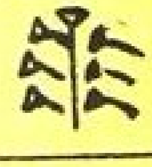	خ	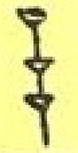	ب	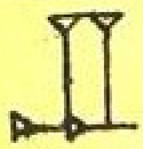
″	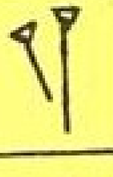	ع	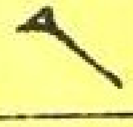	ط	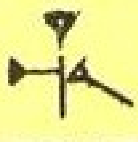	ج	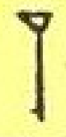
ٹ	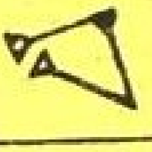	غ	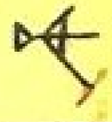	ی	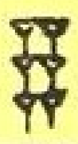	و	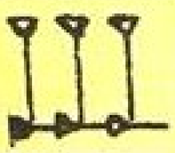
ژ	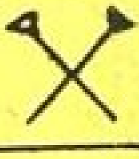	ف	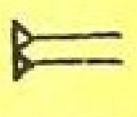	ک	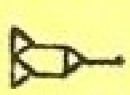	ذ	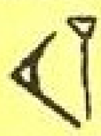
ث	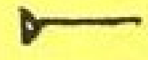	ص	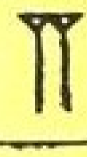	ل	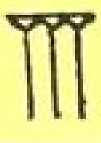	ہ	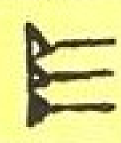

ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آوازوں کے لئے متعدد نشانات ہیں جن کے تلفظ میں یقیناً کچھ فرق رہا ہوگا جس کا علم ہمیں نہیں۔ سمیری بابلی اور آشوری اقوام کے پیکانی رسم خط کی طرح یہ بھی بائیں سے دائیں کو لکھا جاتا تھا، لیکن اس کا اُن سے کوئی تعلق نہ تھا۔

آرمینیا (نویں صدی ق-م) آرمینیا کے لوگوں نے آشوری رسم خط سے اپنی ضرورت کے لحاظ سے کچھ نشانات چن لئے اور اُن میں سے ہر نشان کو بجائے کئی آوازوں کے ایک آواز کا مظہر قرار دیا۔ اس رسم خط کی یہ ایک خصوصیت تھی کہ جب دو پیکان ایک دوسرے کو منقطع کرتے تو بجائے صلیب 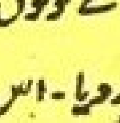 کے یہ شکل 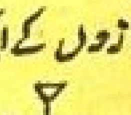 بنائی جاتی اور ایسا اس لئے کیا جاتا کہ کھڑے اور آڑے پیکانوں کے ملنے کی جگہ پر کا پتھر ٹوٹ جاتا تھا۔

شاہان وان کی یادگاروں اور مٹی کی تختیوں کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں یہ رسم خط عام طور سے رائج تھا۔ وانی کے کتبات کی زبان (ALARODIAN) گروہ کی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے جس کی موجودہ نمایندہ جارجین زبان ہے۔

جب آرمینیا میں آریہ لوگ آباد ہوگئے تو یہ رسم خط متروک ہوگیا۔ اس کا کوئی کتبہ ساتویں صدی ق-م کے بعد کا نہیں ہے۔ اس رسم خط کو ارمنی (ARMENIAN) کے علاوہ وانی (VANNIC) بھی کہتے ہیں۔

قدیم فارسی رسم خط چھٹی اور چوتھی صدی ق-م کے درمیان فارس میں پیکانی رسم خط مستعمل تھا۔ اس میں کل ۴۱ نشانات تھے، جن کے ترکیبی پیکانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ان میں سے ایک نشان لفظوں کو جدا کرنے کے لئے اور چار آہورا مازدا، بادشاہ، سرزمین اور صوبہ کے الفاظ کے مظہر تھے:-

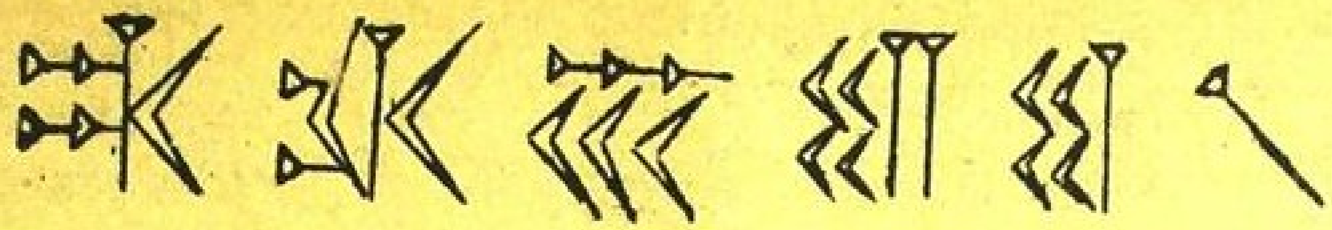
لفظوں کو جدا کرنے والا نشان
داہیا (صوبہ)
بومی (زمین)
شیاتھیا (بادشاہ)
آہورا مازدا (خدا کا نام)

بقیہ ۳۶ نشانات حروفِ علت (VOWELS) اور حروفِ صحیح + حروفِ علت SYLLABLES تھے وہ یہ ہیں:-[لہ]

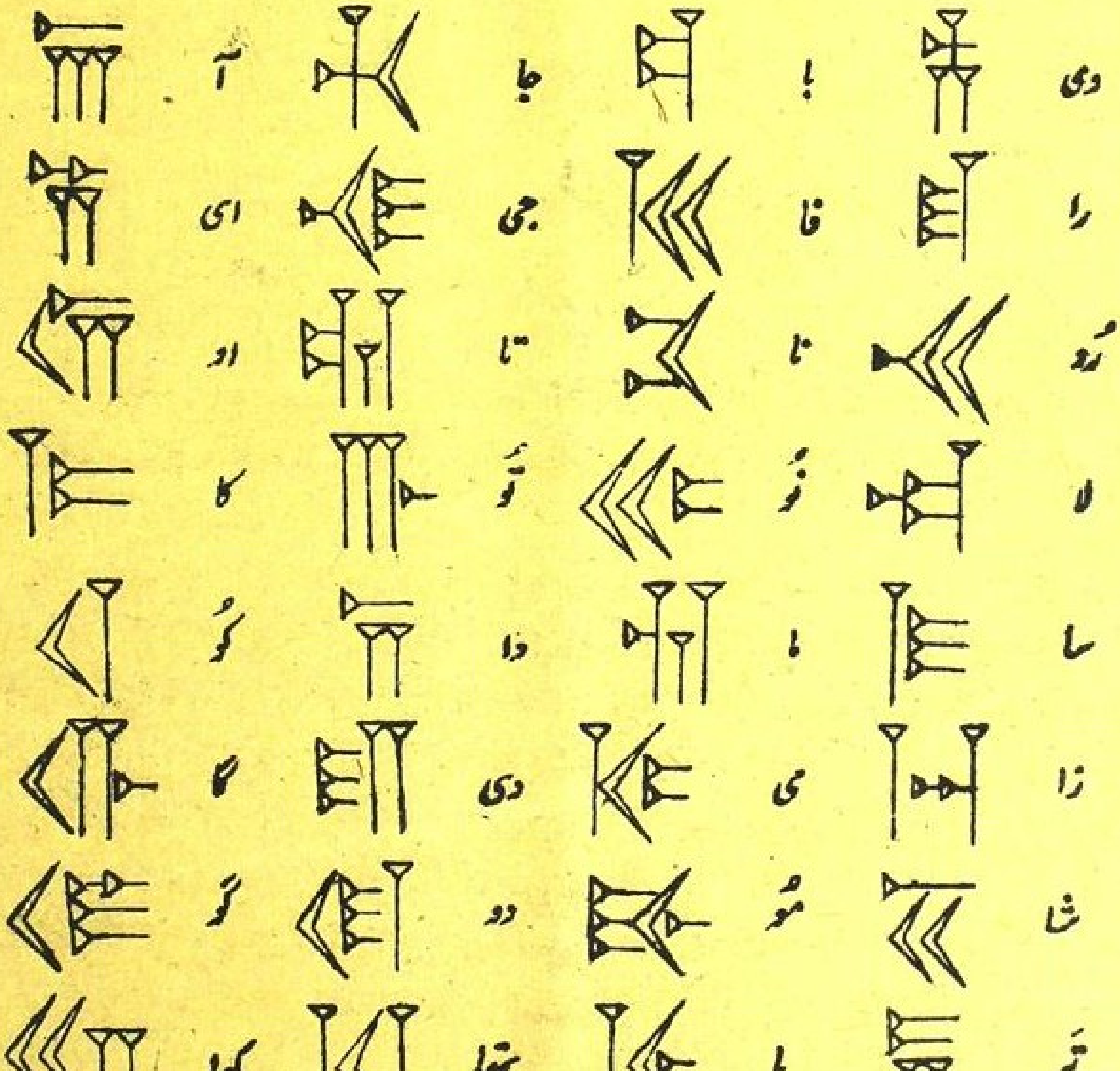
وی
با
جا
آ
را
فا
جی
ای
رُو
نا
تا
او
لا
نُو
تُو
کا
سا
با
دا
کُو
زا
می
دی
گا
شا
مُو
دو
گو
تر
یا
تھا
کھا
ہا
ط
پا
چا

لہ اس نقشہ میں فارسی حروف کو سنسکرت حروفِ تہجی کے مطابق ترتیب دینے میں سرہینری راؤلنسن کی پیروی کی گئی ہے۔

ابھی تک یہ بات نہیں طے ہو سکی کہ آیا فارس کا میخی رسم خط رفتہ رفتہ ارتقاء پذیر ہوا تھا یا اُس کے نشانات بہ یک وقت وضع کر لئے گئے تھے۔ مزید برآں اُس کا وادیِ دجلہ و فرات کے رسم خط سے کیا تعلق تھا۔ (PROF OPPERT) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ پہلے ایران کے لوگوں نے آشوری رسم خط سے چند نشانات لئے پھر اُنھیں آشوری ناموں کے بجائے فارسی نام دئے اور ان ناموں کے شروع کی آواز لینے اور پیکانوں کے گھٹانے یا طرزِ ترتیب میں فرق کرنے سے فارسی کا میخی رسم خط بنا۔ مثلاً:۔

	(معنی)	(لفظ)	(زبان)	
	شہزادہ	روبو	اشوری	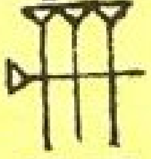
(۱)	آقا	ماتشا	فارسی	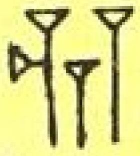
	پیر	سیپو	اشوری	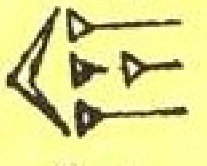
(گ)	،	گزیکا	فارسی	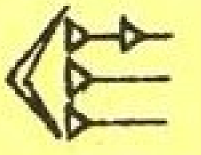
	سورج	شمش	اشوری	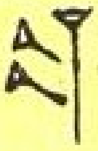
(گو)	،	گرو	فارسی	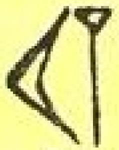

لیکن اب یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ہو سکتا کہ اُس کے نشانات کا آشوری اور بابلی رسم خط کے پیکانی حروف سے کوئی تعلق نہ ہو اور صرف پیکانوں کے استعمال کا تخیل اُن سے ماخوذ ہو۔ اسی طرح بجائے سیکڑوں کے چند درجن نشانات استعمال کرنے کی خواہش آرامی حروف تہجی کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہوگی جس کا استعمال رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔

فارس کے پیکانی حروف کی ایجاد کا زمانہ بھی مشکوک ہے بعض کیخسرو یا سیروس کبیر کا عہد (۵۲۹--۵۵۰ ق۔م) ظاہر کرتے ہیں اور بعض دارا یا داریوش اعظم (۴۸۶-۵۲۱ ق۔م) کا۔ بہرحال اس رسم خط کے مشہور کتبے دارا اور اُس کے زمانہ کے بعد کے ہیں جن میں اہم ترین "بےستون کی چٹان کا کتبہ"[1] ہے اس کے بعد نقشِ رستم اور کوہ الوند کے کتبات ہیں۔ خشیارشا (XERXES) یا زریر کا وہ کتبہ بھی قابلِ ذکر ہے جو وان کی جھیل کے پاس ایک چٹان پر کندہ ہے۔ علاوہ ازیں اصطخر (PERS POLIS) کے کتبے بھی خاصے اہم ہیں۔

خاندانِ ہخامنشی (ACHAEMENID DYNASTY) کے علاوہ (جس میں دارا اور زریر وغیرہ شامل تھے) خاندان سلیوکس (SELUCID DYNASTY) کے کتبے بھی اسی رسم خط میں پائے جاتے ہیں۔

شاہانِ عجم نے اپنے کتبے تین زبانوں میں کندہ کرائے ہیں اسی لئے اُنھیں (TRILINGUAL INSCRIPTIONS) کہتے ہیں۔ یہ زبانیں (۱) قدیم فارسی (۲) ایلمی اور (۳) بابلی ہیں۔ ان کا رسم خط بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بابلی رسم خط کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اب ہم ایلمی رسم خط کا ذکر کرتے ہیں۔

ایلم کا پرانا رسم خط PROTO-ELAMITE

خلیج فارس کے شمالی مشرقی علاقے کو پرانے زمانہ میں ایلم کہتے تھے اُس کا دارالحکومت سوسا یا شوشان تھا۔ اس علاقہ میں تقریباً وہی حصہ شامل تھا جسے اب خوزستان

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد "غبارِ خاطر" کے مقدمے میں لکھتے ہیں "ایران کے قدیم آثار میں ایک اثر "بےستون" کے نام سے مشہور ہے اور داستان سراؤں نے اُسے فرہاد کوہ کن کی طرف منسوب کر دیا ہے مگر یہ اصل میں "بےستون" نہیں ہے "بہستون" (بہستان یا بغستان) ہے۔ قدیم فارسی میں باغ "خدا" یا "دیوتا" کو کہتے تھے یعنی یہ مقام "خداؤں کی جگہ" ہے ـــــ انگریزی (BEHISTUN)

کہتے ہیں یہاں پر پرانے زمانے میں ایک تصویری لکھائی کا رواج تھا جس میں کئی سو نشانات کام آتے تھے مثلاً:-

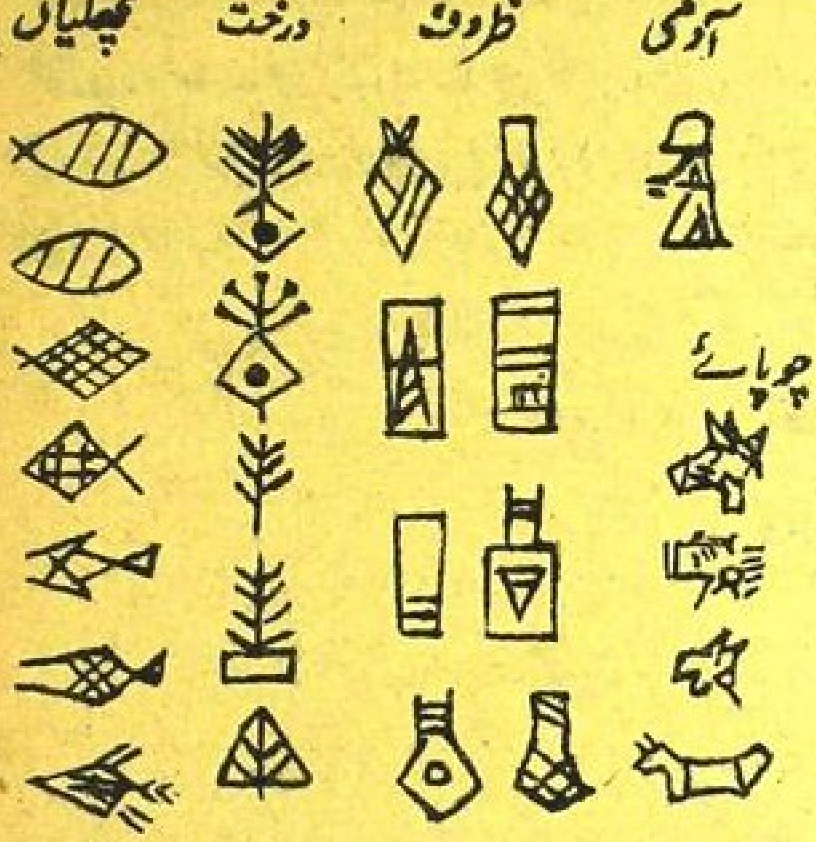

اس لکھائی کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے بجز اس کے کہ گنتی کی علامتوں کا کسی حد تک پتہ چل گیا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہو گئی ہے کہ اُن کے حساب کی بنیاد اعشاریہ والے طریقہ پر رکھی گئی تھی۔

اس رسم خط کا سمیریوں کے رسم خط سے گہرا تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایلم والوں کا رسم خط سمیریوں سے ماخوذ ہو یا اس کے برعکس سمیریوں کا ایلم والوں سے اور یا پھر دونوں کا ماخذ ایک ایسی لکھائی ہو جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ اور یہی بات وادیٔ سندھ کے رسم لخط کے متعلق کہی جا سکتی ہے جس کی علامتوں سے ایلمی اور سمیری رسوم خط کی علامتیں بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔

اس رسم خط کے کتبے بہت کم ہیں۔ پتھر پر لکھے ہوئے کتبوں کی تعداد صرف نو ہے اور مٹی کی تختیوں کی کئی سو (زمانہ تقریباً ۳۰۰۰ ق۔م) لکھائی کا رخ عموماً دائیں سے بائیں کو ہے اور کمتر بائیں سے دائیں کو۔ ایسے کتبے بھی ہیں جن پہ دونوں طرف سے لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ لکھائی کی شان (LINEAR) ہے یعنی اُنمیں سیدھی لکیریں زیادہ ہیں۔ اور گولائیاں کم۔

ایلیم کا نیا رسم خط (NEO-ELAMITF)

بعد میں یہاں کے باشندوں نے پرانی تصویری لکھائی کو چھوڑ دیا اور بابل والوں کے میخی رسم خط سے اپنی ضرورت بھر کے نشانات چُن لئے (تخمیناً ساتویں یا چھٹی صدی ق۔م) پھر اُن میں بھی کافی تبدیلیاں کی گئیں، اس لکھائی میں کل ۱۱۳ نشانات کام آتے تھے جن میں ۸۰ سے کچھ اوپر ارکانِ الفاظ (SYLLABLES) تھے اور بقیہ الفاظ کے مظہر (IDFOGRAMS) اور معنی متعین کرنے والے نشانات (DETERMINATIVES) تھے شاہانِ عجم کے پرانے کتبات پر قدیم فارسی کے بعد دوسری جگہ اسے دی جاتی ہے اور تیسری بابلی کو۔ تینوں ایک دوسرے سے ممیز ہیں لیکن پھر بھی ایلمی اور بابلی رسم خط میں میں تھوڑا سا فرق ہے یہاں پر ہم "بے ستون" کے کتبے پر پائے جانے والے دادیوش اعظم کے نام تینوں رسوم خط میں درج کرتے ہیں جن سے آپ اس کا باہمی فرق سمجھ سکتے ہیں:-

فارسی

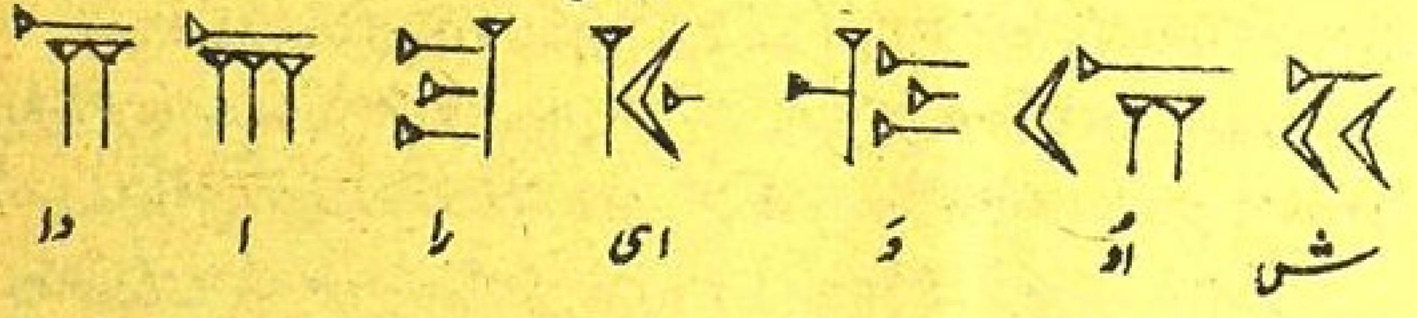

بابلی

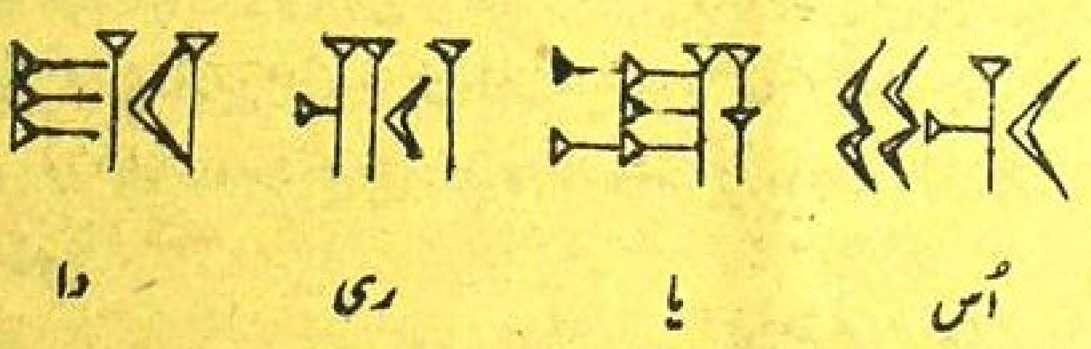

ایلمی

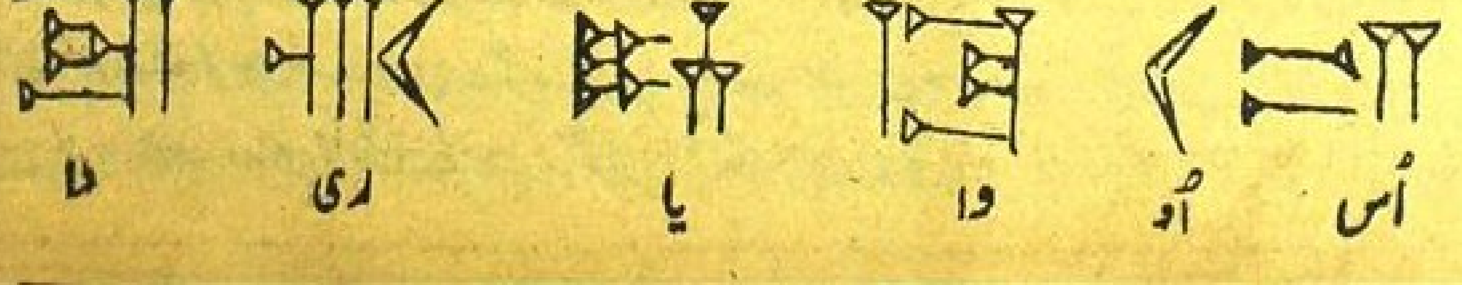

ان تینوں لکھائیوں کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ فارسی رسم خط کے

لفظوں کی زبان ہند یورپی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ بابلی حصے کی زبان سامی ہے اور ایلمی کتبات کی زبان (AGGLUTINATIVE) ہے۔ وہ یورال التائی شاخ سے تعلق رکھتی ہے (مسٹر تارس کا کہنا ہے کہ وہ فن لینڈ کی سوادی زبان سے مشابہ ہے) اُسے ایران کے شمالی مغربی حصے کی سیتھی قوم بولتی تھی۔

ایلم کی لکھائی کے اور بھی کئی نام ہیں۔ دارالحکومت کے لحاظ سے سوسائی (SUSIAN) سوسا کے شمالی حصے یعنی میڈیا میں لکھا جانے کی وجہ سے (MEDIAN) اور لکھنے والوں کی قومیت کے لحاظ سے اُسے (SCYTHIAN) کہتے ہیں۔

میخی رسم خط کا خاتمہ

بابل اور آشوریا کی سلطنتوں کا کمزور ہو جانا میخی رسم خط کے خاتمہ کا ایک بڑا سبب تھا۔ کیخسرو کی فتح بابل (۵۳۹ ق م) اس لکھائی کے حق میں ایک ضرب کاری ثابت ہوئی۔ بابل کی تباہی کے بعد اس کا استعمال رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔

اس کے متروک ہونے کا ایک دوسرا سبب فنیقی رسم خط کی ایجاد و اشاعت تھی (بابلی اور آشوری رسوم خط میں سیکڑوں نشانات کام آتے تھے جن میں سے بعض چودہ چودہ پندرہ پندرہ پیکانوں سے بنتے تھے، برخلاف اسکے فنیقی رسم خط میں کل ۲۲ حروف کام آتے تھے جن کا لکھنا بڑا ہی آسان تھا۔ فنیقی رسم خط کی ارامی شکل ۸ ویں صدی ق۔م شام میں رائج ہو گئی تھی اور اُس کا رواج بابل اور آشوریہ میں بھی ہونے لگا تھا لیکن جب تک یہ ملک آزاد رہے ارامی رسم خط میخی کی جگہ نہ لے سکا۔ ارامی رسم خط بابل میں چھٹی صدی ق۔م۔ کے خاتمہ یا پانچویں صدی ق۔م کے آغاز سے پہلے نہیں ظاہر ہوتا۔ اُس کی ترویج کی رفتار سست لیکن یقینی تھی۔ بہر حال میخی رسم خط سنہ عیسوی کی ابتدا تک رائج رہا۔ اُس کا آخری کتبہ ایک تختی ہے جو غالباً سنہ ۷۵ء میں لکھی گئی تھی اور اب میونخ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

میخی رسم کا پڑھا جانا

میخی رسم خط کو دنیا بھول چکی تھی۔ یہاں تک کہ اصطخر (PERSEPOLIS) کے کھنڈرات میں پائے جانے والے میخی کتبات نے مغربی سیاحوں اور عالموں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ جرمن معلم جی۔ ایف گروٹ فنڈ نے سنہ ۱۸۰۲ء میں اُس کے بعض اُصول و قواعد اور بہت سے نشانات کی آوازیں معلوم کیں اور انگریز عالم میجر جنرل سر ہنری رالنسن نے سنہ ۱۸۴۶ء میں بیستون کے پورے کتبے کو پڑھ ڈالا۔ یہ کتبہ ۵۰۰ فیٹ اونچی سپاٹ چٹان پر کندہ ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ تین رسوم خط میں ہے۔ سب سے پہلے فارسی رسم خط پڑھا گیا پھر ایلمی اور بعد میں بابلی۔ آخر میں سمیری رسم خط کی باری آئی جس کے انکشاف کا سہرا بھی رالنسن کے سر ہے۔ شہنشاہ اشور بنی پال (۶۲۶ - ۶۶۸ ق۔م) کے کتبخانہ سے جو تختیاں ملیں انھیں میں سے بعض پر غور کرتے ہوئے رالنسن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کتبے کسی ایسی قوم سے متعلق ہیں جو سامی اقوام سے پہلے عراق میں آباد تھی، لنارمنٹ اور بعض دوسرے عالموں نے اس خیال کی مخالفت کی لیکن آخر میں یہ بات ٹھیک نکلی۔ سر ہنری رالنسن کو بجا طور پر آشوریات کا باپ کہا جاتا ہے۔

مصری ہیروغلیفی رسم خط

مصری ہیروغلیفی رسم خط کی تاریخ میخی سے مختلف ہے۔ میخی رسم خط وادیِ دجلہ و فرات میں ایجاد ہوا اور ایران کی مغربی سرحد سے لیکر ایشیائے کوچک تک پھیل گیا جس میں مختلف زبانیں لکھی جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے ہیروغلیفی رسم خط وادی نیل تک محدود رہا (بحیرہ متوسط کے ساحل سے لیکر جنوب میں جزیرۂ فیرو تک تخمیناً ۷۰۰ میل لمبے قطعۂ ملک میں) اور اُس میں صرف مصری زبان لکھی جاتی تھی۔ اس کا آخری کتبہ رومی شہنشاہ (THEODOSIUS I.) کے عہد (سنہ ۳۹۴ء) کا ہے

وجہ تسمیہ

مصر میں یونانی حکومت کے زمانہ تک (جس کا آغاز سکندر کی فتح مصر سے ہوا) تصویری رسم خط مندروں اور مقبروں کی دیواروں تک محدود تھا۔ بریں بنا، یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس نے اُسے "مقدس حروف" (GRAMMATA HIERO) کہا ہے اور ڈیوڈورس نے "مقدس منقوش حروف" (GRAMMATA-HIEROGLYPHIKA) کلیمنٹ اسکندری (زمانہ تقریباً سنہ ۲۰۰ء) نے بھی یہی نام لکھا ہے اور اسی سے انگریزی نام (HIEROGLYPHIC) ماخوذ ہے جس کی معرب صورت "ہیروغلیفی" یا "ہیراغلفی" ہے۔

عام طور سے ہیروغلیفی رسم خط کے معنی "تصویری لکھائی" لئے جاتے ہیں لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ ہیروغلیفی رسم خط کا اطلاق

اصل کے اعتبار سے صرف مصر قدیم کی تصویری لکھائی پر ہوتا ہے اور محتاط لکھنے والے اس لفظ کا استعمال انھیں معنوں میں کرتے ہیں۔ "ہیروغلیف" کے انگریزی زبان میں ایک اور معنی بھی ہیں یعنی "نہ سمجھ میں آنے والی چیز" بر ایں بنا کہ یہ رسم خط شروع میں بڑی مشکل سے پڑھا گیا تھا۔

نشانات کی قسمیں۔ مصری رسم خط کے نشانات کی ظاہری اعتبار سے دو قسمیں ہیں سادہ تصاویر اور تصاویر خیالی۔

۱۔ سادہ تصاویر (PICTOGRAPHS) دنیا کی کوئی چیز یا بات ایسی نہیں ہے، جس کی تصویر مصری رسم خط میں نہ پائی جاتی ہو۔ ہر طرح کے جانور اور ان کے اعضا، مرد، عورت اور ان کے اعضا، دیوی دیوتا، مختلف عمارتیں، فرنیچر، مناظر فطرت، کھانے پینے کا سامان، لباس، آلات، مختلف سواریاں، مختصر یہ کہ ہر چیز کی تصویر ان کے رسم الخط میں پائی جاتی ہے مثلاً:۔

رس نکالنا	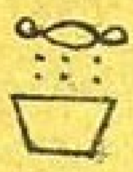	ترازو	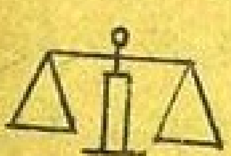	اہرام	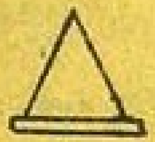	چاند	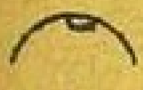
مچھلی پکڑنا	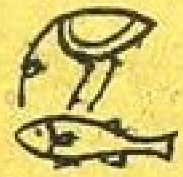	تاج	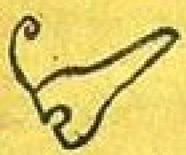	مینار	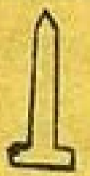	تارا	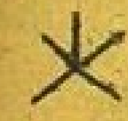
چھپنا	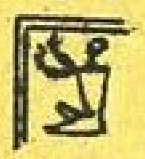	ترکش	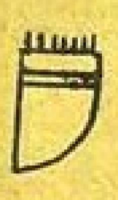	زینہ	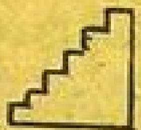	سورج	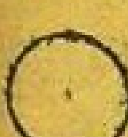
پروہت	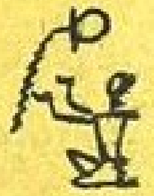	رتھ	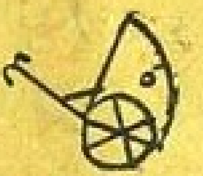	قلعہ	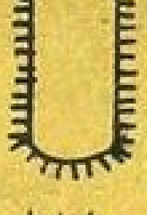	روشنی	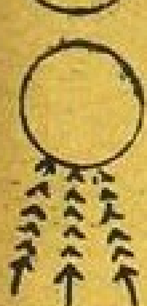
ستار	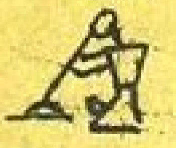	کشتی	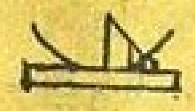	اناج	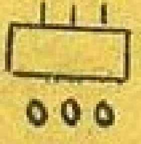	باغ	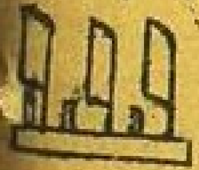

۲۔ تصاویر خیالی (IDEOGRAPHS) یعنی کسی چیز کی تصویر بنا کر بجائے قریب کے دور کے معنی مراد لینا۔ زمانۂ سلف کی دیگر اقوام کی طرح اہل مصر بھی صفت کے لئے موصوف، سبب کے لئے سبب اور مظروف کے لئے ظرف بناتے تھے بعض خیالات کا اظہار مرکب تصاویر سے کیا جاتا تھا مثلاً:۔

مندر	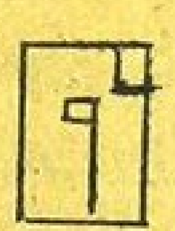	بادشاہت	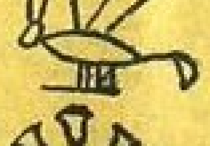	زندگی	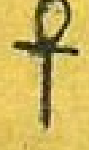	ہوا	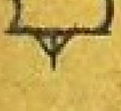
شام	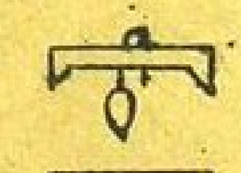	شمالی مصر	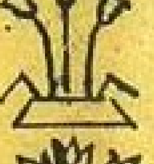	روح	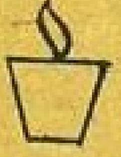	شراب	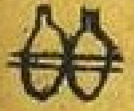
رات	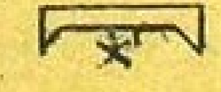	جنوبی مصر	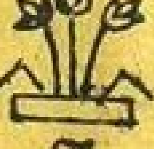	شروع	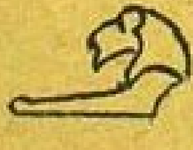	تیل	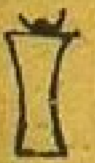
بارش	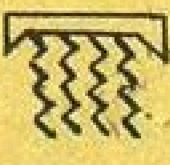	پیاس	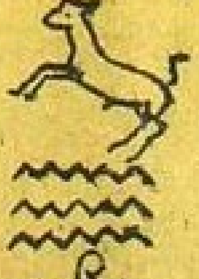	ختم	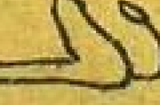	سونا	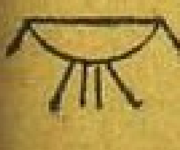
طوفان	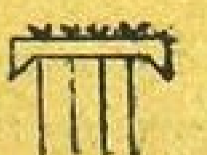	مندر	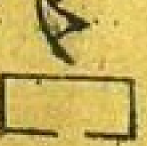	چالاکی	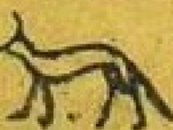	کپڑے	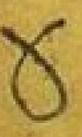

اُن کی لکھائی میں ہوا کے لئے بادبان، شراب کے لئے خُم اور تیل کے لئے بوتل کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ سونا (طلا) کے لئے سونے کی برادہ چھاننے کا کپڑا اور کپڑوں کے لئے گٹھری بناتے تھے، مردانہ اور زنانہ اعضائے تناسل کا اتصال ایک نئی جان کو وجود میں لانے کی بنا پر زندگی کی علامت تھا۔ روح کے لئے چراغ بناتے۔ شروع یا آغاز ظاہر کرنے کے لئے شیر کے جسم کا اگلا حصّہ اور ختم کے لئے پچھلا۔ گیدڑ چالاکی کی علامت تھا اور شہد کی مکھی اپنی قوتِ نظم ونسق کی بنا پر بادشاہت کی۔ پیپرس (ایک پودا) کو شمالی مصر اور کنول کو جنوبی مصر کا مظہر مانتے تھے۔ پیاس کے لئے پانی اور مینہ کی تصویر بنائی جاتی تھی۔ انصاف کے واسطے شتر مرغ کا پر بنایا جاتا کیونکہ وہ خیال کرتے تھے کہ شتر مرغ کے سب پر برابر ہوتے ہیں اسی لئے مندر کے لئے جس سے انصاف کا خیال وابستہ تھا شتر مرغ کا پر اور گھر بناتے۔ کلہاڑی کو دیوتا کا نشان مانتے تھے، اسی لئے مندر کے واسطے کلہاڑی اور گھر بھی بنایا جاتا، اگر اُنھیں شام کا وقت ظاہر کرنا ہوتا تو وہ آسمان میں ایک کنول کا پھول لٹکا دیتے، کیونکہ شام کو وہ پھول بند ہو جاتا ہے۔ رات لکھنے کے لئے آسمان میں ایک تارا لٹکا دیا جاتا اور بارش کے لئے آسمان سے پانی برستا ہوا دکھایا جاتا۔ اُن کے نزدیک آسمان چار ستونوں پر ٹکا ہوا تھا لہذا جب وہ طوفان لکھنا چاہتے تو آسمان کو ان ستونوں سے پھسلتا ہوا دکھاتے۔

معنوی اعتبار سے مصری نشانات کی چار قسمیں ہیں:۔

۱۔ تصویری الفاظ (WORD SIGNS)[1] یعنی تصویر جو پورے لفظ کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ مصری زبان کے الفاظ ایک سے لیکر تین حروفِ صحیح سے مرکب ہوتے ہیں۔ جن الفاظ میں ایک حرفِ صحیح ہوتا ہے اُنھیں (UNICONSONANTAL SIGNS) کہتے ہیں مثلاً۔

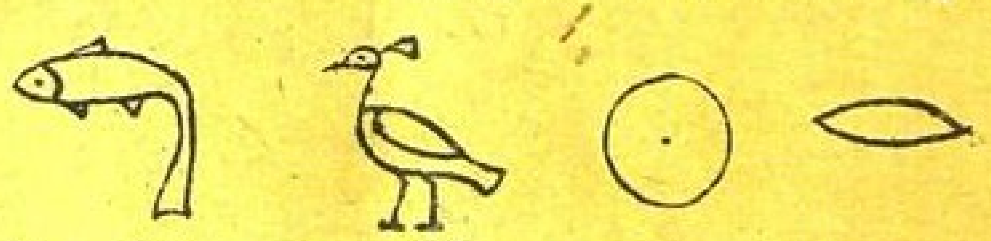

رو	را	کھو	کھا = (تلفظ)
دروازہ۔ دہانہ	سورج	حفاظت کرنا	مچھلی = (معنی)

جو الفاظ دو حروفِ صحیح سے مرکب ہوتے ہیں اُنھیں (BICONSONANTAL SIGNS) کہتے ہیں۔ جیسے:۔

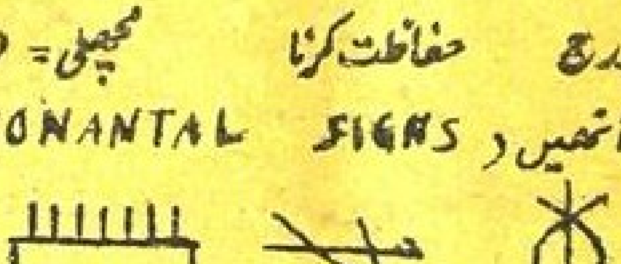

م۔ س	م۔ ر	م۔ ن = (تلفظ)
پیدا ہونا	محبت	رکھنا = (معنی)

مصری رسم خط میں حروفِ صحیح کے بیچ میں آنے والے حروفِ علت کو ظاہر نہیں کیا جاتا۔ حروفِ علت شامل کرکے ان کو یوں پڑھا جائیگا

مِس۔ مِر۔ مِن ......

جو الفاظ تین حروفِ صحیح سے مرکب ہوتے ہیں اُنھیں (TRICONSONANTAL SIGNS) کہتے ہیں جیسے:۔

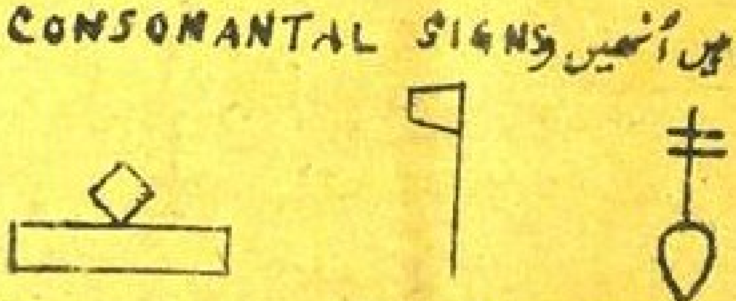

ن۔ ت۔ ر	ن۔ ف۔ ر	ہ۔ ت۔ پ = (تلفظ)
مقدس۔ دیوتا	اچھا	پرشاد = (معنی)

انھیں حروفِ علت ملا کر یوں پڑھا جائے گا۔ ہیتیپ (یا ہوتیپ) نیفر۔ نیتر۔ ....

---

[1] انھیں (LOGOGRAMS) بھی کہتے ہیں۔

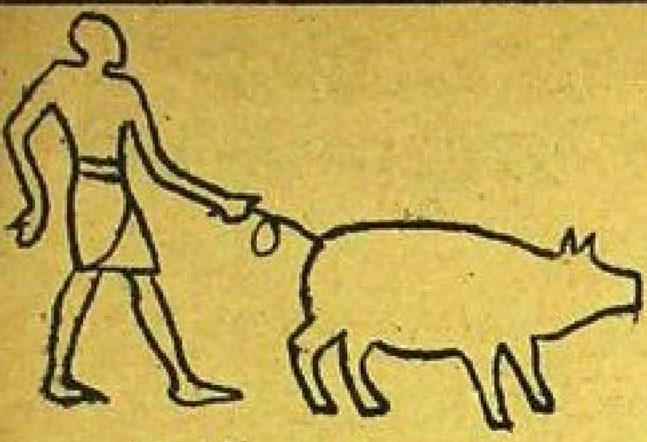

۲۔ تصویری کلمات (SYLLABIC SIGNS) ظاہر ہے کہ ہر چیز کی تصویر نہیں بنائی جاسکتی اس لئے اہلِ مصر بہت جلد "ریبس والا طریقہ"[1] ایجاد کرنے پر مجبور ہوگئے یعنی مختلف معنی رکھنے والی تصاویر کو ملاکر کوئی نیا لفظ لکھنا جیسے اُن کی زبان میں لاجورد کو "خیس تیب" کہتے تھے لیکن "خیست" کے معنی روکنے اور "تیب" کے معنی سور کے تھے لہٰذا لاجورد لکھنے کے لئے سور کو روکتے ہوئے آدمی کی تصویر بنائی جاتی تھی۔

تصویری کلمات اصل کے اعتبار سے یک حرفی اور دو حرفی کلمات ہوتے ہیں لیکن اس صورت میں وہ معنی نہیں دیتے

۳۔ تصویری حروف (ALPHABETK-SIGN) علم الحروف کا ایک اصول ہے (ACROPHONY) کہتے ہیں یعنی لفظ کے شروع کی آواز لے کر بقیہ حصے کو حذف کردینا۔ اس اصول کے مطابق قدیم مصریوں نے اپنے بعض الفاظ کو حروف بنالیا تھا۔ مثلاً اُن کی زبان میں شیرنی کو لابو کہتے تھے لہٰذا شیرنی کے نشان کو آواز "ل" کا مظہر قرار دیا گیا۔ پانی کو نُون کہتے تھے لہٰذا پانی کی لہر آواز "ن" کی حامل قرار پائی۔ اسی طرح اُلّو جسے ملوک کہتے تھے آواز "م" کی نمائندگی کرنے لگا اسی طرح اُنھوں نے بعض یک حرفی کلمات کے آخری حروفِ علت کو حذف کرکے "مفرد" حروف بنالیا۔

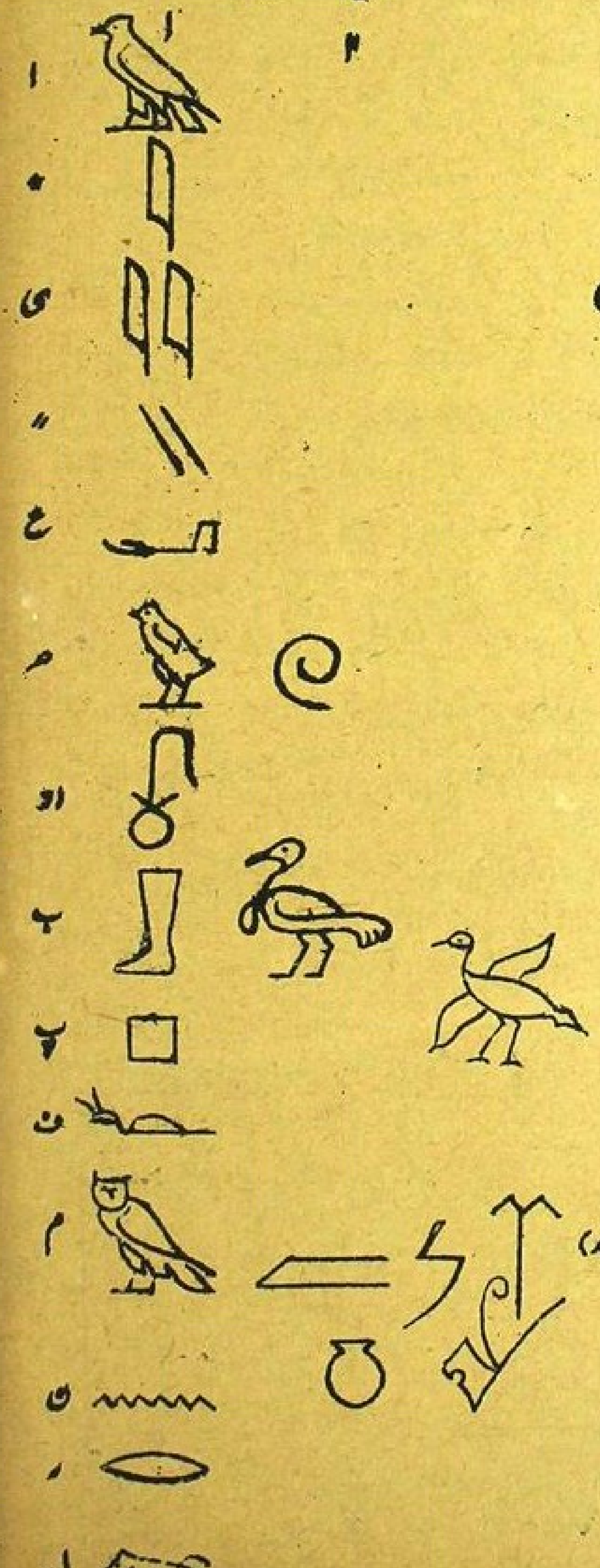

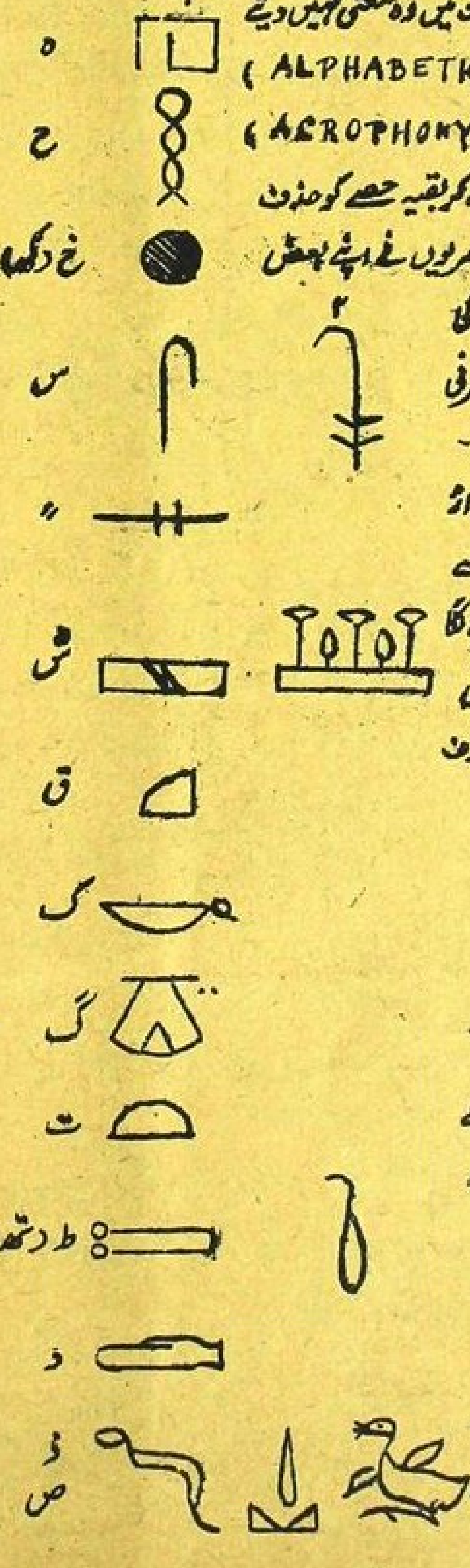

مصری حروف تہجی یہ ہیں:۔

۱۔ عام طور سے کام آنے والے

۲۔ کم استعمال کئے جانے والے

---

[1] اس طریقہ پر ہم جنوری کے نگار میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔

۴ - صوتی سابقے اور لاحقے (PHONETIC COMPLEMENTS) مصری رسم خط میں اکثر الفاظ کے ساتھ اُن کے شروع یا آخر کا حرف بھی بنا دیتے ہیں تاکہ تلفظ معلوم کرنے میں آسانی ہو جیسے :-

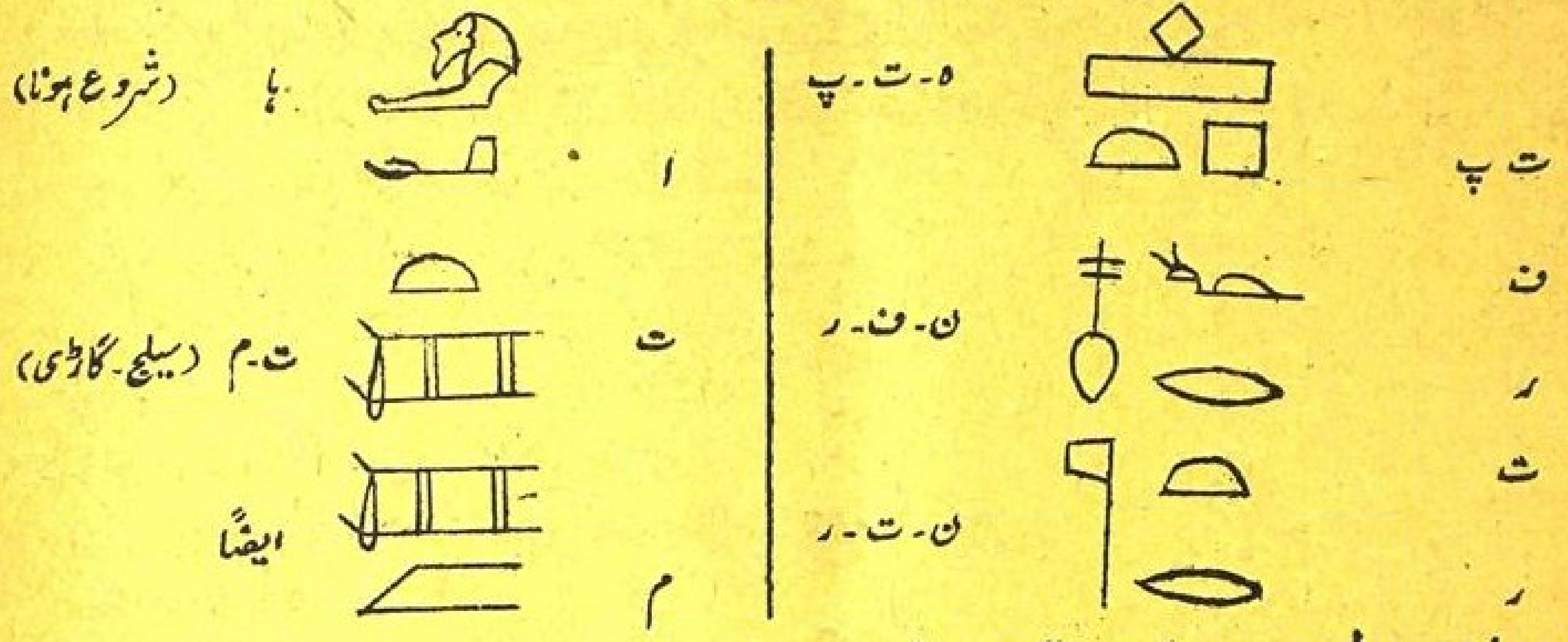
ت پ
ہ - ت - پ
ف
ن - ف - ر
ر
ت
ن - ت - ر
ر
ہا
(شروع ہونا)
ا
ت
ت.م (سلیج - گاڑی)
ایضاً
م

ان مثالوں میں نیچے اوپر اور دائیں طرف لکھے ہوئے تصویری حروف -

۵ - معنی متعین کرنے والے نشانات (DETRMINATIVES) ان کی دو قسمیں ہیں ایک تو عمومی (GENERIC) اور دوسرے خصوصی (SPECIFIC) عمومی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کا نام لیا گیا ہے وہ کس "قسم" کی چیز ہے آیا وہ کسی دیوتا کا نام ہے - مرد کا نام ہے یا کسی عورت کا وغیرہ وغیرہ ایسی بعض علامتیں یہ ہیں :-

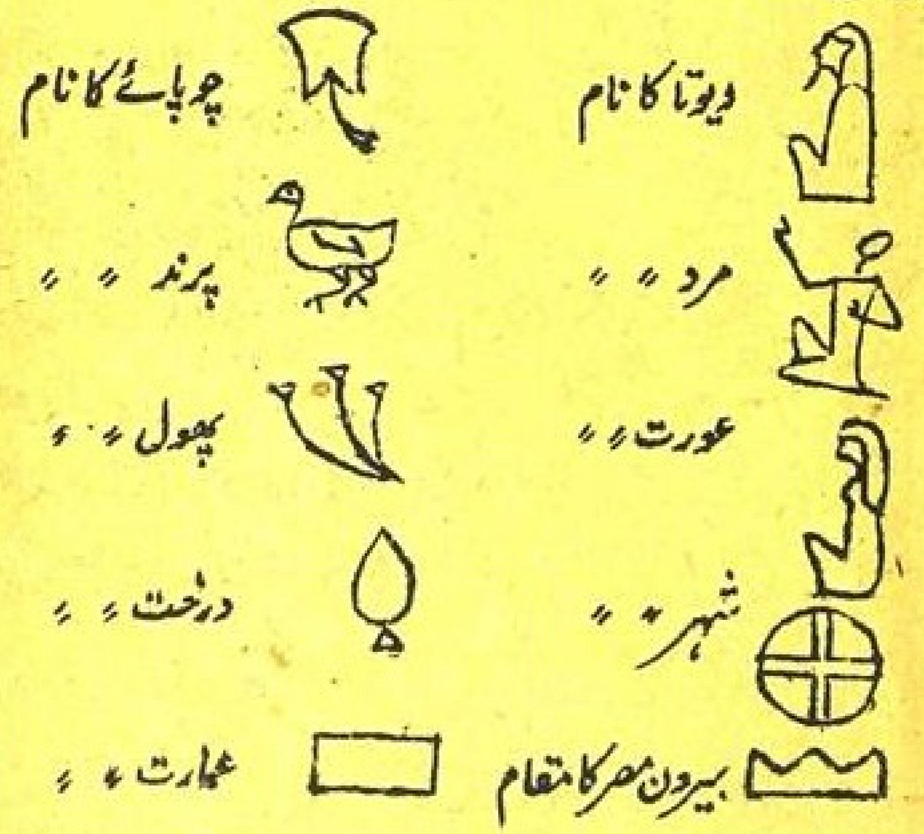
دیوتا کا نام
چوپائے کا نام
مرد ״ ״
پرند ״ ״
عورت ״ ״
پھول ״ ״
شہر ״
درخت ״ ״
بیرون مصر کا مقام
عمارت ״ ״

خصوصی :- یک حرفی اور دو حرفی کلمات سے الفاظ لکھنے کے بعد اُن کے معنوں کی تصویر بنا دیتے ہیں مثلاً :-

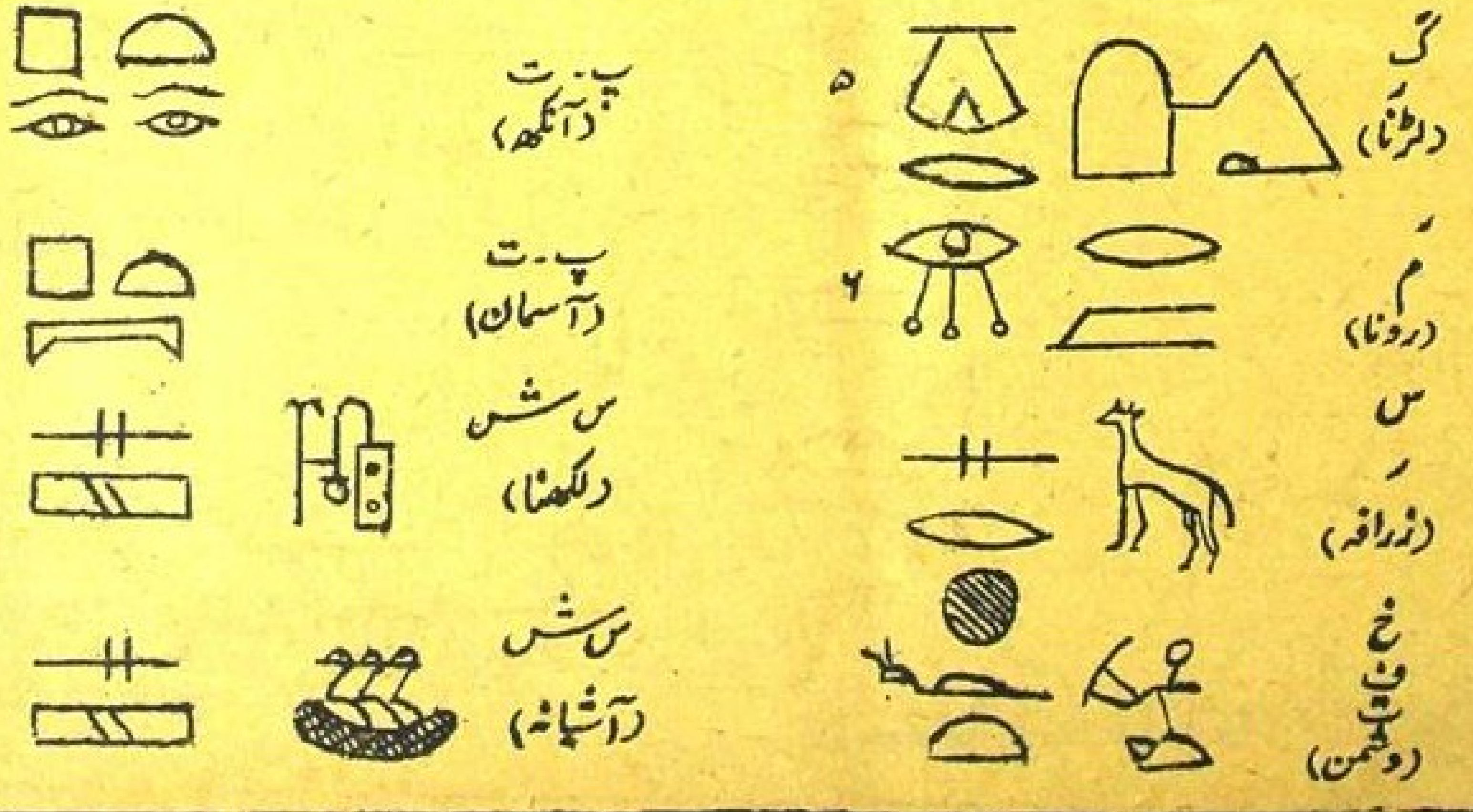
گ
ر
(لڑنا)
۵
ر
م
(رونا)
۶
س
ر
(زرافہ)
خ
ف
ت
(دشمن)
پ - ت
(آنکھ)
پ - ت
(آسمان)
س ش
(لکھنا)
س ش
(آشیانہ)

ان کے استعمال کی دو وجہیں تھیں ایک تو محض خوبصورتی کے خیال سے (بلا ضرورت) اور دوسرے اس لئے کہ مصری زبان میں اکثر الفاظ کے متعدد معنی تھے مثلاً "پیت" کے معنی آنکھ بھی ہیں اور آسمان بھی۔ ہذا ان معنوں میں تمیز کرنے کے لئے حرفوں میں لکھ کر دونوں کی تصویریں بنا دیں۔ اس طرح "سیش" کے معنی لکھنا بھی ہیں اور چڑیا کا گھونسلہ بھی۔ لہذا انھیں بھی حرفوں میں لکھ کر ان کی تصویریں بنائیں۔

ان تصاویر کو پڑھا نہیں جاتا۔ یہ صرف معنی معلوم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمارے لئے قدیم مصری زبان اور رسم خط پہ عبور حاصل کرنا بڑا آسان ہوگیا۔

مصری ہیروغلیفی میں جس چیز کی جمع بنانی منظور ہوتی اُسے تین مرتبہ لکھدیتے یا اُس کے نیچے تین لکیریں کھینچ دیتے مثلاً جب روحیں لکھنا ہوتیں تو تین بگلے بنا دیتے یا ایک بگلہ بناکر تین لکیریں بھی اسی کے ساتھ بنا دیتے (روح کا اظہار ان کے یہاں بگلے سے ہوتا تھا)

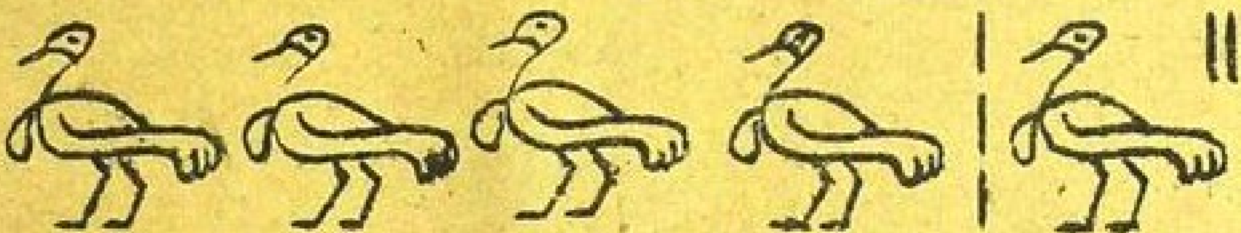

یہ مصری رسم خط میں کام کرنے والے نشانات کی خاص خاص قسمیں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مصر کی لکھائی میں تقریباً ۷۰۰ تصویریں کام آتی تھیں۔

لکھائی کا رخ مصری رسم خط نیچے سے اوپر کو چھوڑ کر ہر طرف سے لکھا جاتا تھا۔ عموماً دائیں سے بائیں کو بسا اوقات بائیں سے دائیں کو اور کبھی کبھی دونوں طرف سے۔ اس صورت میں کچھ حصہ دائیں طرف سے پڑھا جاتا ہے اور کچھ بائیں طرف سے اور وسط میں آکر ختم ہوجاتا ہے، لیکن ایسا محض خوبصورتی کے خیال سے کیا جاتا ہے۔ عمودی کتبوں میں فراعنۂ مصر کے نام اوپر سے نیچے کی طرف لکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

پڑھنا کدھر سے شروع کیا جائے گا اس کا پتہ نشانات کے رُخ سے چلتا ہے جدھر جانوروں اور پرندوں وغیرہ کا منھ ہوتا ہے اُدھر ہی سے پڑھتے ہیں۔

عرصہ ہوا ڈاکٹر ایل۔ اے ویڈل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مصری رسم خط سمیری سے ماخوذ ہے۔ (دونوں کے بہت سے نشانات صوری۔ صوتی اور معنوی لحاظ سے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔) اور اب عام طور سے یہ نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

(باقی) محمد اسحاق صدیقی

"نگار" کے فایل

نگار ۳۳ء لغایۃ ۵۲ء کے مکمل مجلد فایلوں کی صرف ایک ایک جلد موجود ہے۔ قیمت ۳۳ء لغایۃ ۴۲ء عہ، و ۴۳ء لغایۃ ۵۲ء عہ فی جلد۔ یکمشت خریدار کو سے ر فی صدی رعایت۔

ب۔ ر
معرفت منیجر نگار۔ لکھنؤ

سید اختر امام کے دو خط

(بغداد اور نیروبی سے)

اختر کی موہنی صورت، ان کی صحت و جوانی، ان کا بلند و پاکیزہ ذوقِ شعر و ادب، ان کا علمی تبحر، ان کا خاندانی امتیاز، ان کا دنیوی جاہ و منصب، اور سب سے بڑھ کر کوثر و تسنیم سے دُھلا ہوا ان کا دل، جب کبھی ذہن میں آتا ہے تو روح وجد کرنے لگتی ہے۔

ان سے پہلی شناسائی خط کے ذریعہ سے ہوئی جب وہ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس کے بعد عربی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد جب وہ بان (جرمنی) گئے تو وہاں سے بھی انھوں نے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا، عربی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد یوروپی ممالک کا سفر کرتے ہوئے جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے آرہ آنے کی بھی زحمت گوارا کی، یہی میری ان سے پہلی ملاقات تھی اور شاید آخری بھی۔

چند دن بعد کلکتہ یونیورسٹی نے پوسٹ گریجویٹ کلاس میں تعلیم دینے کے لئے ان کا تقرر کیا اور پھر وہ کالمبو یونیورسٹی (لنکا) میں شعبۂ عربی کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے مقرر ہوئے یہاں ان کو بارہ سو روپے ملتے تھے، لیکن بقول اختر "اقتصادی تقاضوں" نے ان کو پاکستان کے محکمۂ امور خارجہ سے رشتہ جوڑنے پر مجبور کیا، پہلے وہ عراق کے سفیر مقرر ہوئے اس کے بعد فروری ۵۳ء سے "نیروبی" (برطانوی مشرقی افریقہ) میں غالباً ہائی کمشنر ہیں۔

اختر کا وطن بہار کا ایک مردم خیز گاؤں "کرائے پرسرائے" ہے۔ نواب امداد امام کے ایک حقیقی بھائی یوسف امام صاحب موضع کرائے پرسرائے میں بس گئے تھے، یہ اختر صاحب کے حقیقی دادا تھے۔

اختر کے سارے کمال میں ان کی دو چیزیں بیحد کشش رکھتی ہیں، ان کی تحریر اور ان کا دل، اختر کی تحریر اتنی ستھری، اتنی پاکیزہ، اتنی صاف ہے کہ اس آئینہ میں ان کا پاک اور معصوم دل جھلکتا ہے ان کی تحریروں میں فن ہے، اور فنی محاسن کے ساتھ ایک بے پناہ دل ربائی۔ ان کے علمی، تاریخی اور ادبی اشارے، اتنے فاضلانہ، محققانہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں کہ تعجب آتا ہے کہ جو شخص اتنا سکون پسند، اتنا تن آسان، اس قدر ہنس مکھ اور لطف و انبساط کا دلدادہ ہو وہ وسعتِ مطالعہ کے لحاظ سے اس قدر جامع کیونکر ہو سکتا ہے۔ اختر کے یہاں معاشی سکون کے ساتھ ہمیں ایک روحانی ٹھہراؤ بھی نظر آتا ہے ان کے چہرہ پر بشاشت کے ساتھ ایک پاکیزہ تبسم بھی پایا جاتا ہے ان کے یہاں تلخی نام کو نہیں، صورت، تکلم، تحریر ان کی ساری چیزیں تلخ احساسات سے پاک ہیں ان کی معصوم اداؤں سے کبھی کسی کو تلخی کا احساس نہیں ہو سکتا اور شاید وہ خود زمانہ کی تلخیوں سے یا تو بیگانہ ہیں یا ان کے تصور کے لئے ان کے ذہن میں کوئی مقام نہیں۔

وہ یورپ میں "اپیرا" کے عشرتکدوں سے بھی لذت اندوز ہوئے لیکن اخلاقی اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا پھر ان محافل سے جی بھر گیا تو دمشق میں حضرت یحیٰی اور بغداد میں حضرت معروف کرخی کی قبروں پر مجاوری بھی کی، وہ مشرقی انداز کے ایک یوروپین شہری معلوم ہوتے ہیں اور اسلامی احکام و شعایر کے باب میں ایک سخت کوش قسم کے متقی بھی۔

اختر بہت بڑے فاضل ہیں وہ بیک وقت جرمن، انگریزی، عربی، فارسی اور اردو پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں جرمن زبان وہ اس روانی و لطافت کے ساتھ بولتے ہیں کہ ایک ناآشنائے زبان بھی یہی چاہے گا کہ وہ جرمن زبان میں بولتے رہیں لیکن اردو زبان سے ان کو ایک غیر معمولی ربط ہے وہ جرمنی سے آرہ آئے تو میں انھیں "جین سدھانت بھون" لے گیا لائبریرین نے رائے لکھنے کے لئے کتاب پیش کی تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب عربی، جرمن اور انگریزی کے بدلے اردو میں انھوں نے اپنی رائے لکھی۔ ان کی عربی اور انگریزی دونوں سے مجھے لطف حاصل ہوگا۔ وہ کسی پر اپنے علم و فضل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے، حالانکہ یہ کمزوری عام طور پر نوجوان علماء میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے قیام سراندیپ کے دوران میں ایک عرب گھرانہ سے ازدواجی رشتہ جوڑ لیا، اور اس کی یادگار عشرت امام سلمہ ہیں۔

عبدالمالک آروی

۳۰ر جون ۵۲ء

عزیز دوست مالک صاحب۔ سلام و محبت!

آپ کو یہ خط بغداد سے لکھ رہا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں یہاں کیسے آدھمکا تو جواب سنئے! لنکا میں چاندی کے دن تھے اور سونے کی راتیں، شوخ و شنگ جوانیاں بھی تھیں، باغات بھی تھے اور نیلگوں آسمان تلے شباب آلود انگڑائیاں لے رہا تھا! اب آپ اسے میری وحشت کہیں یا تلون، ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اس مادی شکل میں تو دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہے، فطرت تغیر کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے، میں ہر لمحہ بلکہ ہر آن نادانستہ طور پر بدلتا جا رہا ہوں اگر بدھ مت کا پیرو ہوتا تو لنکا جیسی ارضی جنت کو ہرگز نہ چھوڑتا کیونکہ اپنے اعمال کے اعتبار سے شاید پھر وہیں مرنے کے بعد جنم لیتا مگر تناسخ سے دور کا بھی مجھ کو لگاؤ نہیں ہے اس لئے میرے سامنے دو مسئلے تھے ایک تو یہ کہ کسی اور بہشت میں سانس لینے کا موقع ملے جو ہر اعتبار سے مختلف ہو، دوسرے یہ کہ ہزار اور بارہ سو ماہانہ میں خود کو ہمیشہ کے لئے مقید کر دینا سنجیدہ حماقت ہے۔ اسی منزل سے گزر رہا تھا کہ چند نادر موقعے ہاتھ آئے، میں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور اس کا حاصل مصدر یہ نکلا کہ میں جنوری ۵۱ء میں جزیرہ سراندیپ کو خیرباد کہتا ہوا کراچی پہونچا اور وزارت خارجہ سے تعلقات قایم کر لئے۔ چند ماہ بعد یعنی جولائی میں حکمنامہ صادر ہوا کہ بہ حیثیت Charge d' affaires یعنی القائم بالاعمال الباکستانیہ کے بغداد چلے جاؤ، چنانچہ چند دنوں بعد میں بال بچوں سمیت تاریخی دجلہ کے کنارے بیٹھا ہوا سانس لے رہا تھا۔ یہ ہے شانِ نزول مجھ صحرانورد کے یہاں آنے کی۔ کہئے اب تو مان گئے کہ میں نے ایک بہاری شاعر کے شعر کو عملی جامہ پہنا دیا۔

رہے ہمارا جنوں سلامت ہزاروں صحرا کو چھان لیں گے
اس ایک دنیا کی کیا حقیقت کہ ناپ ڈالا جسے قدم سے

یعنی یوں سمجھئے کہ میں نے درس و تدریس کی پاکیزہ فضا کو چند سکوں کے عوض مکدر کر ڈالا ہے۔ کیا کیجئے گا اقتصادی تقاضے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں!

مالک صاحب، آپ اس ایک برس کے عرصہ میں اکثر یاد آئے اور اپنی تمام سادگیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے رہے۔ آپ میرے ان چند گنتی کے مخصوص دوستوں میں ہیں جن کی ذات پر میں فخر کرتا ہوں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ کی شخصیت مرے تمام دوستوں سے ممتاز ہے۔ آپ سے زندگی میں ایک بار اور صرف ایک بار ملاقات نصیب ہوئی ہے مگر لذت تجدید سے محرومی کے باوجود ہمیشہ کچھ ایسا محسوس کرتا رہا جیسے برسوں کی ملاقات ہو، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں اصلی مالک کو اس کے علمی مقالوں اور دلنشیں خطوں کے ذریعہ تاک جھانک کر دیکھتا رہا ہوں اور اجنبیت کے رسمی حجابات خود بخود اٹھتے گئے۔ آپ نقاد، ادیب، فنکار اور "مولوی"

کی حیثیت سے خود کو علمی محفلوں میں پیش کرتے رہے۔ خسرو، مرزا غالب، گوئٹے اور ٹیگور کی طرح آپ نے اپنے شدید احساسات کو صفحوں پر منتقل تو کیا مگر خود صفات اور ذات میں جو توازن قایم رکھا وہ یقیناً قابلِ رشک ہے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی مگر بات در اصل حیرت کی نہیں ہے وہ یہ کہ آپ کے تمام وہ خطوط جو آپ نے وقتاً فوقتاً مجھ کو لکھے ہیں میں نے ہمیشہ ان جواہر پاروں کو سینہ سے لگائے رکھا۔ آج بہت زمانہ بعد جی چاہا کہ "حسینوں کے خطوط" اور "تصویر بتاں" کو باقاعدہ ادوار میں تقسیم کردوں اور انھیں کتابی شکل میں مرتب کر ڈالوں اس لطیف کام میں منہمک تھا کہ آپ مسکراتے نظر آئے۔ آپ کہیں گے واہ بھئی اختر صاحب میں اور متبسم؟ میں تو قنوطی ہوں یہاں مسرت کا گزر کہاں مگر جانے کیوں آپ کی یاد ہمارے لئے حسرت و یاس کی بجائے ہمیشہ شادیانی کا موجب ہوتی ہے۔

اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل !

آپ کے خطوط کو جن میں بعض لچھے دار بھی تھے بار بار پڑھتا رہا اور پڑھنے کے بعد دیر تک کچھ ایسا محسوس کیا جیسے شمپینی پی لی ہو، ایک وجدانی کیفیت جس کی سرحدیں شباب کی عشرت ناک راتوں سے جا ملتی ہیں۔ مجھ کو اپنی قوس قزحی دھاریوں میں لپیٹے رہیں! کیٹس نے سچ کہا تھا "ایک حسین شے دائمی مسرت کا سرچشمہ ہے۔"

چاہتا ہوں کہ کچھ اس سرزمین کے حالات سناؤں جس کا ذرہ ذرہ تاریخی عظمت سے درخشاں ہے۔ بابل و نینوا کے کھنڈرات قدیم عیسائی خانقاہیں جو قرون وسطیٰ کی رعایات اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور طاق کسریٰ کی ہیبتناک محراب جہاں تالیاں بجاتے ہی صدائے بازگشت ہزاروں تالیاں سناتی ہے۔ اسلامی عہد کی عمارتیں تو تقریباً ناپید ہیں۔ ہلاکو نے تو سب کچھ خاکستر کر ڈالا تھا مگر قبرستان اُس جہاں سوز کی زد سے بچ گئے اس لئے آج بھی آپ بغداد میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہے حضرت سری السقطی کی آرامگاہ اور ان کے برابر ان کے مرید خاص حضرت جنید بغدادی کی ضریح مبارک ہے۔ ذرا پرے ہٹ کر حضرت معروف کرخی ہیں اور ان کے روضہ سے دو قدم پر منصور حلاج کا مقبرہ ہے۔ کوئی دو میل پر حضرت امام اعظم (حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) ہیں اور اسی خطہ میں رابعہ بصری محوِ خواب ہیں۔ سیدنا عبدالقادر الجیلانی اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ زبیدہ یعنی ہارون الرشید کی ملکہ ابدی نیند سو رہی ہے۔ بغداد سے کوئی پچیس میل باہر طاق کسریٰ سے قریب تین صحابہ کرام آرام فرما رہے ہیں حضرت سلمان فارسی حضرت جابر الانصاری اور حضرت حذیفہ الیمانی۔ شہر کی دوسری جانب کربلا اور نجف ہیں۔ ذرا اندازہ کیجئے عظمت کا!

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

پچھلے دنوں بصرہ گیا تو حضرت امام حسن بصری اور اسی مقبرہ میں ابن سیرین جو خواب کی تعبیر میں یدطولیٰ رکھتے تھے، کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر جیسے صحابی رسول بھی وہیں ہیں۔ موصل شہر کے باہر حضرت یونس اور حضرت شیث مدفون ہیں اور قدیم نینوا کا کافی حصہ شہری آبادی میں ضم ہو گیا ہے۔ موصل سے ٹیکسی کی اور اربیل پہونچا یہاں صوبۂ بہار کی طرح خانقاہیں ہیں اور پیر طریقت شافعی مذہب کے پیرو ہیں ایک گاؤں سے گزرا جہاں ابن خلکان پیدا ہوئے تھے کوردیہ سا دیہات۔ موصل میں ابوتمام اور ابن الاخیر کی قبریں دیکھیں! فاعتبروا یا اولی الابصار!

اسی قدر لکھنے پایا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دفتر نے یاد دلایا ہے کہ آج ڈنر کے لئے باہر جانا ہے۔ اس لئے اب بہروپئے کی طرح نئے رنگ میں باہر نکلنا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ موجودہ بغداد بلکہ عراق کے حالات لکھوں مگر اس کو اب آپ کے جواب آنے پر ملتوی رکھتا ہوں۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا
اختر امام

۳ر جون ۵۳ء

عزیز دوست مالک صاحب۔ سلام و محبت

بہار کے مشہور شاعر نواب امداد صاحب اثر نے میر تقی میر کے رنگ میں ایک شعر کہا تھا اور جہاں تک میں اس شعر کے ذریعہ اثر کی تحلیل نفسی کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ ابونواس اور اعشیٰ کی طرح آزادانہ پھرا کئے اور تمام زمینی مسرتوں سے لطف اندوز ہوئے، جس کا حاصل مقصدِ عشق ہے۔ شعر ہے:۔

جنگل جنگل صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں
آہو وحشی جان کے مجھ کو ساتھ ہمارے رہتے ہیں

اگر اثر زندہ ہوتے تو میں باادب عرض کرتا کہ جنگل آپ کی قسمت میں نہیں بلکہ آپ کے پوتے کی قسمت میں لکھا تھا۔ جنگل تو ویسے ہزاروں ہیں، کچھ گھنے جن میں کچھ جنگلی جانوروں کی بھی پرورش ہے بعض بس ویرانے جہاں کوسوں تک آدمی اور جاندار شے کا نشان تک نہیں ہے، اِکے دُکے ببول کے درخت اور چاروں طرف ہولناکیاں جن کے بارے میں غالباً خواجہ آتش نے کہا تھا:۔

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر، لا دے اک جنگل مجھے بازار سے،
یا پھر:۔ جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی، عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

مگر مالک صاحب یقین مانئے میں جس جنگل میں سانس لے رہا ہوں وہ میر انیس کے تخیل سے بھی بالاتر ہے۔ یہاں تو حقیقی معنوں میں

جنگل کے شیر ہونک رہے "ہیں" کچھار میں

مگر میں بھی بڑا سڑی آدمی ہوں کہ آپ کو آرہ سے جنگل میں کھینچنا چاہتا ہوں اور وہ بھی براہ راست۔ مچھیرے پہلے روپہلے جال پھینکتے ہیں پھر مچھلیاں شکار کرتے ہیں اس لئے اسی زمردیں وسعتوں میں دعوت دینے سے پہلے یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے اُس محبت نامہ کا دلی شکریہ ادا کروں جو آپ نے ہمیں بغداد بھیجا تھا وہ جواہر پارے اب تک سینہ سے لگائے ہوئے ہوں۔ آپ نے اس خط میں خطیب بغدادی اور ابن خلکان کا بھی ذکر کیا تھا۔ جب میں فروری میں بغداد سے رخصت ہونے لگا تو ان تمام بزرگوں کی خدمت میں سلام کے لئے حاضری دی۔ جب مسجد ابی حنیفہ سے گزرتا ہوا عباسیہ قبرستان کے پچھواڑے بشر الحافی کے سرہانے پہونچا تو فاتحہ میں آپ کو بھی شریک کر لیا۔ خطیب کی قبر کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ بعض اہلِ علم کے ذریعہ اس یکتائے روزگار محقق کی آخری آرامگاہ سے واقف ہو چکا تھا۔ جب خطیب کے سامنے پہونچا تو دیکھا کہ ایک کمرہ ہے جہاں لکڑیوں کا انبار ہے اور ایک بڑھئی بسولہ لئے ہوئے لکڑیوں کو کاٹ رہا ہے۔ میں نے دل میں کہا ارے ظالم تجھے خبر بھی ہے کہ تو کس کے سینہ پر یہ ضرب لگا رہا ہے؟ پھر خیال آیا آخر خطیب نے بھی تو انسانی کردار کی تشکیل کی تھی، قلب ماہیت کے لئے بسولہ سے زیادہ تیز قلم ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ فاتحہ کے بعد بڑھئی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کس کے فاتحے پڑھ رہے تھے یہاں تو کوئی قبر نہیں ہے میں نے کہا جہاں تم بیٹھے ہو اس کے نیچے ایک فخر روزگار سو رہا ہے۔ خطیب بغدادی۔ وہ بیچارہ ہکا بکا سا رہ گیا، بولا کون خطیب؟ میں نے کہا تھے ایک سیدھے سادھے بزرگ۔

——"ان کا انتقال کیا ترکوں کے زمانہ میں ہوا تھا؟"

——"نہیں ان سے صدیوں بیشتر۔"

جب وہاں سے لوٹا تو سوچا کہ ذرا ابوبکر شبلی کو بھی سلام کرتا چلوں وہاں پہونچا تو شکستہ مقبرہ میں لحد پر قرآن شریف کے منتشر اوراق پڑے تھے، دیر تک بیٹھا رہا۔ کبھی خیال آتا کہ بقول Arberry تصوف کا چراغ چند صدیوں کو اُجالا کرنے کے بعد جھلملا جھلملا کر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ کیا آربری سچ کہتا ہے؟ کیا انسان کے پراگندہ دل و دماغ کو یکسوئی اور سکر آمیز لذت اس دو آتشہ سے اب حاصل نہیں ہو سکتی ہے؟ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ فاقہ کش مجاور مقبرہ میں داخل ہوا، میں نے کہا اس مقبرہ کی مرمت کیوں نہیں ہوتی ہے

اس نے جواب دیا کس کس کی مرمت کی جائے یہاں تو ہزاروں گنج گرانمایہ پڑے ہوئے ہیں، میں نے کہا بھائی سچ کہتے ہو، اسی قبرستان میں ابن ندیم اور رابعہ بصری کی آرامگاہ ہے۔ زمانہ نے ان نقوش کو ملیا میٹ کردیا۔ حضرت جنید بغدادی موجودہ بغداد سے باہر ہوائی اڈے سے اسی طرف محو خواب تھے، آپ اپنے پیر سری السقطی کے برابر مدفون ہیں۔ میں پیر اور مرید کے درمیان دو زانو ہوکر زمان و مکان کے قیود سے ہر لمحہ نکلتا گیا۔ خدا جانے کہاں پہونچ گیا تھا، نہ یہ بغداد تھا اور نہ اسکی پیرس صفت عشرت گاہیں، نہ موٹروں کا ہجوم اور نہ ریڈیو کی چیخ پکار۔ جب دوبارہ ہزار برس بعد کی دُنیا میں داخل ہوا تو نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس کیا جیسے ان باکمال ہستیوں سے ہمکلام ہوچکا ہوں، ایک غیر مسموع آواز سُنی تھی جس کے لئے نہ لفظ کفالت کرتے ہیں اور نہ فن بیان۔ بہلول دانا کے یہاں بھی یہ نشہ سر میں موجود تھا۔ ابراہیم خواص سے ہوتا ہوا جب کار میں جاکر بیٹھا تو ڈرائیور سے کہا ذرا شیخ معروف کے یہاں چلو۔ شیخ مسجد کے گوشہ میں اس طرح آرام کررہے ہیں کہ گنبد کا آخری زاویہ بلکہ مسجد کی دیوار حلقہ کئے ہوئے ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف شہر خموشاں ہے۔ شیخ کے مقبرہ کے بارے میں خطیب نے لکھا ہے کہ جب کوئی حاجت مند دو رکعت سنت کے بعد ننانوے مرتبہ قل ھو اللہ یعنی سورۂ اخلاص پڑھ کر شیخ کی روح پر ایصال ثواب کرتا ہے اور خدا سے دُعائیں مانگتا ہے تو دُعا کامیاب ہوتی ہے پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ھذا مجرب" میں نے بھی اسی تفصیل کے ساتھ دعا مانگی۔۔ حقیقت یہ ہے کہ میں جس دنیاوی چکر میں مبتلا تھا اس سے نجات کی صورت بظاہر نظر نہیں آتی تھی، اب اسے آپ شیخ کی کرامت کہیں یا ایک مادہ پرست کی حیثیت سے اسے حسن اتفاق یا دلچسپ حادثہ سے تعبیر کریں۔۔ میں خلاف توقع اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ میں اکثر جمعہ کی نمازیں شیخ کی مسجد میں پڑھا کرتا تھا کیونکہ وہاں کی قرأت میں رعشہ سیماب پایا جاتا تھا۔

سیدنا عبدالقادر محی الدین الکیلانی کے کیا کہنے، اب بھی ایک چشمہ جاری ہے۔ بغداد سے باہر کوئی پچیس میل دور حضرت سلمان فارسی، حضرت حذیفہ الیمانی اور حضرت جابر الانصاری، طاق کسریٰ کے برابر مدفون ہیں۔ اللہ اللہ عراق کی سرزمین بھی کس حد تک حیات افروز ہے۔

ایک دن خلاف توقع سرکاری حکمنامہ ملا کہ نیروبی جاؤ۔ سنگ آمد و سخت آمد۔ بغداد سے جب نیلگوں آسمان میں پرواز کررہا تھا تو نیچے علم و عرفان کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا رفتہ رفتہ یہ منظر بھی روپوش ہوگیا۔ چند گھنٹوں بعد لق و دق صحرا کے سینہ کو چاک کررہا تھا۔ دمشق اترا تو مسجد اعظم گیا۔ میں نے اتنی دلکش اور وسیع مسجد نہیں دیکھی تھی۔ خالص عربی تعمیر کا نمونہ ہے جو بنو امیہ کی یادگار ہے۔ نہ گنبد اور نہ قبے بس ایک شاندار ہال پھیلتا چلا گیا ہے۔ مسجد میں داخل ہوا تو تین حلقے تین بزرگوں کے تفسیر قرآن اور درس حدیث میں منہمک تھے۔ میں ہر حلقہ میں شریک ہوتا گیا۔ بھئی یہ شامی عرب کتنی فصیح عربی بولتے ہیں بس یہی جی چاہتا ہے کہ عمر بھر سنتا رہوں۔ مسجد کا جو بڑا سا ہال ہے اس کے وسط میں ایک قبر دیکھی جس کے چاروں طرف چاندی کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ہے قبر حضرت یحیٰ علیہ السلام کی۔ اسوقت شیخ سعدی یاد آگئے جنھوں نے گلستاں کے کسی باب میں لکھا ہے:

"بربالیں تربت حضرت یحیٰ علیہ السلام معتکف بودم در جامع دمشق"

میں بھی شیخ کی اتباع کرتے ہوئے سرہانے بیٹھ گیا، کیا عجب کہ ہماری قسمت شیخ سعدی کی پاکیزہ جگہ ہو! سلطان صلاح الدین ایوبی اور شیخ محی الدین ابن عربی بھی اسی دمشق میں مدفون ہیں۔ ابن عساکر یاد آگئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیز، شہاب الدین الزہری اور الاخطل جیسا پکیڑ (ٹھیٹھ بہاری اصطلاح رہے نا؟)

دمشق میں مغربی اور مشرقی بلکہ عربی قدروں کی جو ہم آہنگی ہے ویسا امتزاج میں نے دنیا کے کسی ملک میں نہیں دیکھا ہے جہاں مسلمان بستے ہوں۔ شہری اعتبار سے یورپ کا نمونہ، تہذیبی نقطۂ نظر سے خالص عربی۔ جب قاہرہ پہونچا اجتماع اضداد کی ایک

بے نظیر تصویر سامنے تھے۔ امراء کے محلے، شراب خانے اور ناچ گھر، یا پھر غریبوں کی دنیا، الازہر، مسجدوں کی آبادیاں، اسلامیت اور بات بات میں ذکر عاقبت اور دنیا کی ناپائیداری، مسجد سے اذانوں کی صدا اور گلیوں میں فاقہ کشوں کے پھیلے ہوئے ہاتھ! میں قاہرہ میں ایک ہفتہ رہا، ابوالہول، اہرام مصر اور الاقصر (Luxor) کے گرد چکر کاٹتا رہا۔ قاہرہ سے نیم شب کے سناٹے میں روانہ ہوا اور سطح سمندر سے ہزاروں فٹ بلند صحرائے اعظم کو عبور کر رہا تھا۔ جب خرطوم پہونچا تو صبح صادق کا سماں تھا۔ مسجدوں کے منارے بڑی شان سے فضا میں بلند تھے۔ یہاں سے چلا تو لنچ کے وقت خود کو Entebbe میں پایا۔ یہ شہر مشہور وکٹوریہ جھیل کے کنارے آباد ہے اور Uganda کا پایۂ تخت ہے۔ اب صحرائے اعظم کے جنوب میں تھا اور ہمارا تعلق صحیح معنوں میں تاریک براعظم سے تھا ہر طرف کالے کالے انسان، کریہہ منظر اور نیم برہنہ عورتیں جن کی پیٹھوں پر شیر خوار بچے تھیلیوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ کوئی تین بجے نیروبی پہونچا۔

نیروبی خط استوا سے قریب ہے مگر چونکہ سطح مرتفع ہے، اس لئے سال بھر تک گلابی جاڑا رہتا ہے۔ یہ انگریزوں کا آباد کیا ہوا دلکش شہر ہے۔ بارونق اور مغربی یورپ کی تمام رعنائیاں لئے ہوئے۔ انگریزوں کے علاوہ تقریباً پچاس ہزار ایشیائی ہیں، جن میں اکثریت ہندوستانیوں کی ہے، بقیہ پاکستانی ہیں۔ یہ سب کے سب تجارت پیشہ ہیں۔ سیاہ فام افریقی اپنے محلوں میں آباد ہیں۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان افریقیوں میں خاصی تعداد مسلمانوں کی ہے۔ میں نے ان کی مسجدیں دیکھی ہیں جو ہمیشہ آباد رہتی ہیں۔ یہ ان باہمت عربوں کی یادگار ہیں جو کبھی سارے عالم پر چھائے ہوئے تھے۔ ساحلی مقامات مثلاً دارالسلام اور زنجبار تو مسلمانوں سے بھرے ہوئے ہیں جو اب بھی گھر پر عربی بولتے ہیں۔

نیروبی سے باہر یا تو انگریزوں کی نوآبادیاں ہیں یا پھر گھنے جنگلوں میں قطعاً وحشی اور غیر مہذب افریقی ہیں۔ یہ قبائلی نظام زندگی میں منقسم ہیں۔ مرد اور عورتیں تقریباً عریاں۔ بعض مقامات پر اب تک آدم خور قبیلے موجود ہیں جن کے گاؤں میں آدمی کا گوشت ایک پرتکلف کھانا تصور کیا جاتا ہے۔ مسائی Masai قبیلہ والے یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر ہیں۔ یہ اب بھی دشمن کو ذبح کرکے اس کا خون دودھ میں ملا کر پیتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کی بہتات ہے اور فطرت کے دلکش مناظر اپنی تمام نزہتوں کے ساتھ انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ کہئے اب تو سمجھے آپ میں کہاں ہوں؟

یہاں ایک طرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ تاریخ سے بھی ہزاروں سال پیشتر کی دنیا سامنے ہے جہاں غاروں میں بسنے والے درندہ صفت نام نہاد انسان کلہاڑیوں سے وحشی جانوروں اور ہم جنسوں کا شکار کھیلتے ہیں اور کچے گوشت کو چبا چبا کر مزے سے کھاتے ہیں یا پھر نیروبی اور دوسرے متمدن شہر جہاں عصر حاضر کی تمام شعبدہ بازیاں موجود ہیں۔ تاریک ماضی اور حال میں جو ہیبتناک فرق ہے وہ آپ ایک نظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ خیر ہٹایئے بھی اس "یا وحشت" کو!

آپ نے لکھا تھا کہ آپ گردہ کے مریض ہیں۔ کبھی میں بھی اس مرض کا شکار تھا۔ میں صرف ہومیوپیتھک کی ایک دوا سے شفایاب ہوگیا تھا۔ آرہ میں تو ہومیوپیتھک دوائیں ملتی ہوں گی۔ آج ہی آنکھ بند کرکے بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ چاند کی ابتدائی تاریخوں میں ایک خوراک Lycopodium CM کھالیں۔ نہار منہ خشک زبان پر۔ ترش چیزوں سے پرہیز کیجئے گا۔ اللہ نے چاہا تو آپ اس مرض سے نجات پا جائیں گے۔

رمضان کے تمام روزے رکھ رہا ہوں۔ یہ دن نہیں ہے بلکہ نیم شب کا سناٹا ہے۔ سوچا کہ آپ کو لکھ کر سحری کھالوں پھر سو جاؤں۔ آپ بہت یاد آتے رہے اس لئے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا۔ یہ ہے شانِ نزول اس لمبے دار خط کی۔

بہار کی تھکی تھکی فضا اب بھی یاد آتی ہے، اس خنکی میں بیزاری بھی تھی اور دلکشی بھی۔ افریقی ماحول کی طرح اجتماع اضداد وہاں بھی تھا۔ شادی بیاہ کے وقت غالباً خسرو کے گیت گائے جاتے تھے:-

اے نیہرّ والی کنگنا تمھارا!
رات اُتارو بھورے پہنو، کنگنوا میں نا پہنوں گی
میاں بنرے کو لگی جیتے چوٹ
کنگنوا میں نا پہنوں گی!!

ہائے ان گیتوں میں کتنی محبت ہے، کتنا رس ہے۔ یہ ماحول اور یہ ساز کے قوس قزحی نغمے کہاں ملیں گے؟ وہ ہمارا رکھ رکھاؤ اس "جاگیردارانہ نظام" کے صدقے جاؤں جہاں کے امراء غریبوں کی پرورش کیا کرتے تھے جہاں دوسروں کا درد محسوس کرتے تھے۔ دل پہ چوٹ لگتی تھی!

یادگار رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک!

"ترقی پسندوں" پر خدا کی مار۔ عورت، چادر، گرما گرم بوسے، مزدور، پسینہ کی قسم، زمینداروں کا ستم۔ سماجی اعتبار سے اصلاح تسلیم۔ مگر انھوں نے تو انسانیت کے دوستوں پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے تنقیص ضرور کی مگر "تعمیری" کام یہ کیا کہ غالب، میر اور تمام دردمند انسانوں پر طنزیہ قہقہے لگائے۔ شہوت میں ایک جسمانی لذت ضرور ہے۔ ہیجان کا نشہ بھی ہے مگر زندگی کے تقاضے اور بھی تو ہیں!

خیر اب اس داستان کو کون چھیڑے ورنہ "دقیانوسی" کہلاؤں گا۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے

آپ کا بھائی
اختر امام

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی
(انجیل انسانیت)
من و یزداں کامل
کا
جدید اڈیشن

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحائفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

بین الاقوامی سرمایہ

بین الاقوامی سرمایہ کے تبادلہ سے مراد سرمایہ کا ایک ملک سے دوسرے ملک کو منتقل ہونا ہے۔ یہ سرمایہ دو مختلف شکلوں میں آتا جاتا ہے۔ زر کی شکل میں اور صنعتی و زراعتی امداد کی صورت میں۔ چونکہ دونوں قسم کے سرمایہ کا تعلق پیدایش دولت سے نہایت ہی اہم ہے اور سرمایہ کی نقل و حرکت، پیدایش دولت ہی کی غرض سے ہوتی ہے اس لئے پہلے پیدایش دولت کے عام مفہوم کو سمجھ لیجئے۔

انسان اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے قدرت کی مختلف پیداوار کو جنھیں عطیۂ قدرت کہنا چاہئے، اپنی صلاحیتوں اور قوتوں سے ایک نئی ترکیب یا نئی شکل دیتا رہتا ہے۔ اور انسان کا یہ عمل، عملِ پیدایشِ دولت کہلاتا ہے۔ عطیات قدرت مثلاً نباتات، معدنیات، جمادات اپنی اصلی شکل میں ہمارے لئے زیادہ کار آمد نہیں، لیکن جب انھیں ہم کھانے، کپڑے، مکان یا برتن کی شکل میں تبدیل کر لیتے ہیں تو ان سے ہماری بہت سی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال قبل جب انسان نے اول اول پتھر کے ٹکڑے کو اوزار بنانے کے لئے توڑا تو اسے صرف پتھر کے ٹکڑے اور جسمانی محنت کی ضرورت پڑی لیکن آج جبکہ زمانہ ترقی کے مختلف مدارج طے کر چکا ہے۔ پیدائشی دولت اس قدر آسان و سادہ نہیں رہی۔ اب یہ عمل بہت وسیع و پیچیدہ ہو گیا ہے، خام اشیاء کی فروخت، کارخانوں کا قیام، نقل و حمل، آسان کام نہیں اور ان کے لئے مصارف کا ہونا ضروری ہے۔ یہ مصارف دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مصارف مقدم دوسرے مصارف ضمنی یعنی ایک وہ مصارف جو کسی شے کی طیاری کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً خام مواد، ایندھن، اجرت وغیرہ۔ دوسرے وہ مصارف جو کسی چیز کی طیاری کے لئے بنیادی حیثیت تو نہیں لیکن ضمنی حیثیت ضرور رکھتے ہیں مثلاً اصل سرمایہ کا سود، کارخانے کا کرایہ، اشتہارات کا خرچ، بیمہ وغیرہ۔ الغرض پیدایش دولت کا انحصار بعض خاص وسایل پر موقوف ہے۔ جن کو معاشیات کی اصطلاح میں وسائل پیدایش کہتے ہیں۔ یہ وسایل چار ہیں۔ زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم۔ ان چاروں کا اہتمام کرنے والے بالترتیب یہ ہیں۔ زمیندار، مزدور، سرمایہ دار اور ناظم۔

اس وقت ہم تیسرے وسیلۂ پیدایش (یعنی سرمایہ) سے بحث کریں گے۔ معاشیات میں سرمایہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ سرمایہ افراد یا قوموں، کی وہ دولت ہے جو مزید دولت پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جائے۔ لیکن اس میں زمین شامل نہیں ہے۔ سرمایہ وہ پیدا یا جمع کی ہوئی دولت ہے۔ جو مزید دولت پیدا کرنے میں صرف کی جاتی ہے۔ اس سے مراد صرف روپیہ نہیں بلکہ روپیہ کی مدد سے حاصل کی ہوئی اشیاء بھی اس میں شامل ہیں مثلاً مشین، کارخانہ کی عمارت وغیرہ غرضکہ ہر وہ چیز جس سے مزید دولت پیدا کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔ اور جسے دوسرے کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ میں شخصی ذہانت، استعداد عقل وغیرہ بھی شامل ہیں۔ جن کو غیر مادی سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی سرمایہ کی بہت سی قسمیں ہیں۔ پیدایش دولت کے لئے وسایل پیدایش کا فراہم ہونا ضروری ہے۔ اور کم سے کم خرچ پر دولت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب یہ وسایل پیدایش بھی کم سے کم قیمت پر فراہم ہو سکیں۔

پیدایش دولت کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کی مقدار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ خام اشیاء کی

بڑی مقدار میں فراہمی مشینوں کی خریداری وغیرہ پر بڑا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ دنیا میں اس وقت ہندوستان کے علاوہ بھی بعض دوسرے ممالک ایسے ہیں جو قدرتی عطیات کے لحاظ سے تو بہت امیر ہیں مگر سرمایہ ان کے پاس کافی مقدار میں نہیں اور ان ملکوں میں دولت کی پیدائش کم قیمت پر اسی وقت ممکن ہے جب سرمایہ باہر کے کسی ملک سے آئے یا ملک کی قدرتی پیداوار (خام اشیا) باہر بھیجی جائیں لیکن چونکہ قدرتی پیداوار بآسانی باہر نہیں بھیجی جاسکتی اس لئے زیادہ تر سرمایہ باہر سے آتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کے بازاروں سے بے انتہا سرمایہ ان ممالک کو بھیجا گیا جو قدرتی دولت کے لحاظ سے امیر سمجھے جاتے تھے، لیکن سیاسی طور پر حکومت برطانیہ کے مستعمرات تھے۔ ہندوستان بھی ۱۹۴۷ء تک برطانیہ کا ایک مستعمرہ تھا۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور جوٹ، روئی، کوئلہ، تل (تلہن) نیل میگنیز وغیرہ اس کی مختلف قدرتی پیداواریں ہیں۔ جو بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے قدم جماتے ہی سارے وسائل پیدائش کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُن کے پاس سرمایہ تھا، جو صنعتی ترقی پر صرف ہوا اور سارا نفع ولایت کے بنکوں میں پہونچتا رہا۔ گزشتہ صدی میں بیرونی سرمایہ ہندوستان کی معاشی و صنعتی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، ریلیں، نہریں، بندرگاہ، چائے کے بڑے باغات، روئی اور جوٹ کے کارخانے، نیل کی کاشت، بڑے بنک اور دوسرے قومی ادارے اسی سرمایہ کے ممنون احسان ہیں۔ گو اس طرح ہم کو صنعتی ترقی ضرور حاصل ہوئی، مگر اسی کے ساتھ خام پیداوار بہت کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی اور مشین کے آجانے سے گھریلو صنعت بھی ختم ہوگئی۔ بیکاری میں اضافہ ہوگیا۔ کارخانوں میں انسان زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخل ہونے لگے اور اس طرح وہ ملک جو ۸۰ فیصدی زراعتی تھا سرمایہ کے برے اثرات سے نہ بچ سکا۔

تقسیم سے پہلے چالیس کرور انسانوں والے ملک میں صرف چند ایسے انسان تھے جو سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار کہلانے کے مستحق تھے مگر ان کا سرمایہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کی ضرورت کے لئے کافی نہ تھا۔ ہندوستان میں کتنا بیرونی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس کی مقدار کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں اس کی مقدار ۱۹۳۰ء تک ۴۹ کرور ۸۰ لاکھ پونڈ تھی اور بعض کے نزدیک ایک کرور پونڈ۔

۳۰ جون ۴۸ء کی ریزرو بنک کے حسابات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان ظاہری طور پر قرضدار ملک نہیں گنا جاسکتا۔ مگر حقیقت حال یہ نہیں۔ کیونکہ بیرونی سرمایہ جو ہمارے ملک میں لگا ہوا ہے، اس پر ہر سال ہم اصل کے قریب سود ادا کرتے ہیں اور اس کا زیادہ تر نفع باہر چلا جاتا ہے، کیونکہ سرمایہ کا بڑا حصہ ایسی شرایط پر دیا گیا ہے کہ اس کا نفع ہم تو نہیں پہونچتا۔ اس میں زیادہ مقدار اس سرمایہ کی ہے جو طویل مدت کے لئے قرض لیا گیا ہے۔

تیس چالیس سال پہلے برطانیہ اہم قرضہ دینے والا ملک گنا جاتا تھا، مگر اس وقت امریکہ کا نمبر اول ہے اور اسوقت تقریباً کل داخلی یا بیرونی سرمایہ کی مقدار جو ہندوستان میں لگا ہوا ہے (۶) چھ ارب ۶۵ کرور روپیہ ہے۔ ہمارے پنج سالہ منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے ۲۰۶۹ کرور روپے کی ضرورت ہوگی، ۱۲۵۸ کرور روپے ملک کے اپنے وسایل سے حاصل کئے جائیں گے ۱۵۶ کرور روپے حکومت ہند کو بیرونی امداد کی شکل میں مل چکے ہیں اور باقی ۶۵۵ کرور روپے کی فراہمی بیرونی قرض کے ذریعہ ہوگی۔

بین الاقوامی سرمایہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قلیل المدت سرمایہ اور دوسرا طویل المدت سرمایہ۔ پہلا سرمایہ کم مدت یا کم وقت کے لئے حاصل کیا جاتا ہے اور یہ زیادہ تر سونے کی شکل میں ہوتا ہے۔ معمولاً یہ سرمایہ ملک کا تجارتی توازن قایم رکھنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر بعض ممالک میں سیاسی بدامنی ہونے پر یا کسی طبقہ سے برا سلوک ہونے پر لوگ

اپنا سرمایہ سونے کی شکل میں باہر بھیج دیتے ہیں جہاں ان کا سرمایہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس کو "تصدیعی سرمایہ" Distress capital کہنا بیجا نہ ہوگا۔ مگر اس طرح سرمایہ کا بہاؤ یک طرفہ ہوجانے پر تجارتی توازن خراب ہوجاتا ہے۔ دوسرا یعنی طویل المدت سرمایہ عام طور پر توازنِ حسابات کو برقرار رکھنے کے لئے قرضہ کے طور پر حاصل کیا جاتا ہے توازن حسابات سے مراد ان تمام حسابات کی تسکین بخش ادائی سے ہے جو ملکوں کے باہمی تجارتی تعلقات کی بنا پر کرنا پڑتی ہو مثلاً ہندوستان زیادہ مدت تک امریکہ سے زیادہ مال لیتا رہے اور اس کی قیمت نہ ادا کرسکے تو وہ مجبور ہوگا کہ اپنا سونا وہاں بھیجے یا پھر اس سرمایہ سے کام لے جو ہندوستان کا امریکہ میں موجود ہے۔ لیکن اگر ہندوستان ان دونوں ذرائع میں سے کسی کو بھی اختیار نہیں کرسکتا تو توازن حسابات برقرار نہ رہے گا۔ اور لامحالہ امریکہ کے لئے یہ ضروری ہوجائے گا کہ اپنا سرمایہ بھیج کر ہندوستان کی معاشیات کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے تجارتی توازن کو برقرار رکھ سکے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو ہندوستان دیوالیہ ہوجائے گا اور امریکہ کی تجارت جو ہندوستان کے ساتھ تھی یکلخت ختم ہوجائے گی اور اس کا اثر امریکہ کے معاشی نظام پر برا پڑے گا۔ کیونکہ وہاں ان تمام اشیاء کا کاروبار بند ہوجائے گا جو باہر بھیجی جاتی تھیں اور ملک میں بے روزگاری بڑھ جائے گی غرضکہ ان وجوہ کی بنا پر سرمایہ کی حرکت ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

طویل المدت بیرونی سرمایہ ملک میں دو طرح سے آتا ہے۔ ایک تو وہ جو Direct loans کہلاتے ہیں۔ دوسرا Port folio investment ۔ پہلی حالت میں قرض دینے والے ملک کو اپنے سرمایہ پر سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور قرض دینے والا خود سارے فایدہ و نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ قرضخواہ ملک کو سود کے طور پر کوئی رقم نہیں ادا کرنی پڑتی۔ وہ صرف اصل سرمایہ کی ادائی کا ذمہ دار ہوتا ہے جو مقررہ مدت کے بعد ادا کرنی ہوتی ہے گو اس طرح قرض لینے والا ملک سود ادا کرنے کی مصیبت سے بچ جاتا ہے اور نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ مگر اسی کے ساتھ اسے قرض دینے والے ملک کی پالیسی کا غلام ہوجانا پڑتا ہے

میں قرض لینے والے ملک کے اختیارات زیادہ ہوتے ہیں اسے ایک خاص مقدار سود کی ادا کرنی پڑتی ہے۔ خواہ فایدہ ہو یا نقصان۔

بین الاقوامی سرمایہ سے تجارتی توازن پیدا ہونے کی بنا پر یہ ضرور ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کی خوشحالی بڑھ جاتی ہے۔ مگر چونکہ قرض لینے والے ملک کو سیاسی پابندیاں بھی قبول کرنی پڑتی ہیں، اس لئے تعلقات میں کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اور لڑائی کا سبب بن جاتا ہے۔

بین الاقوامی سرمایہ کا اثر دنیا کے قدرتی وسایل پر بھی پڑتا ہے کیونکہ اس طرح خام پیداوار کا استعمال بڑھ جاتا ہے کاروبار ترقی کرتا ہے، بیروزگاری گھٹتی ہے اور معاشی حالت سنبھلتی ہے، دوسرے ملک کی ایجادات و اختراعات سے فایدہ اٹھا سکتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل انیسویں صدی کے شروع میں حکومت برطانیہ بڑا اہم قرض دینے والا ملک تھا۔ مگر اسکے بعد حکومت برطانیہ کو خود امریکہ سے قرضہ لینے کی ضرورت پڑی اور امریکہ نے بڑی مقدار میں اپنا سرمایہ ان ممالک کو بھیجا جہاں خاص طور پر لڑائی ہوئی اور جہاں جنگ کے اثرات شدت سے محسوس کئے گئے تھے۔ لڑائی کے دوران میں ہر ملک اپنی بقا کے لئے لڑائی کا سامان زیادہ بنانا شروع کردیتا ہے مگر لڑائی ختم ہوتے ہی یہ سب سامان بیکار ہوجاتا ہے اور ملک کو اصلی حالت پر لانے کے لئے نئے سرے سے سرمایہ کی ضرورت پڑتی ہے، ان بہت سے بے روزگاروں کا انتظام کرنا پڑتا ہے جو پہلے لڑائی میں مصروف تھے پہلی جنگ عظیم کے بعد انھیں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے امریکہ کا سرمایہ باہر جانے لگا اور قبل اس کے کہ دنیا پہلی جنگ کی مصیبتوں سے آزاد ہوتی اسے دوسری جنگ عظیم کا سامنا کرنا پڑا اور ہر طرف سے بیرونی سرمایہ کی مانگ بڑھنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ اپنی داخلی و خارجی پالیسی کی بنا پر بین الاقوامی سرمایہ کا مرکز بن گیا۔ امریکہ کی تجارت باہر کی دنیا کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے اور توازن حسابات قایم رکھنے اور اپنی معاشیات کو سنبھالنے کے لئے آج بہت سے ملک، امریکہ کے سرمایہ دار کا منھ دیکھ رہے ہیں اور اس مضبوطی کی بنا پر آج امریکہ دنیا کی ایک بڑی طاقت بن چکا ہے۔

(ختم) عائشہ ایم۔ اے

جلوے

(مولوی عبدالحق)

یہ تحریری خاکوں کا ایک سلسلہ ہے جو صرف ان اکابر سے تعلق رکھتا ہے جن سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں اس سلسلہ کا پہلا خاکہ مولوی عبدالحق سے تعلق رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق، علی گڑھ کالج کے مایۂ ناز فرزند اُردو زبان کے سب سے بڑے محسن، اور اُردو ادب کے بلند پایہ محقق اور نقاد ہیں۔ علی گڑھ کالج سے گریجویٹ ہونے کے بعد انسپکٹر آف اسکول وغیرہ کی منزلوں کو طے کرکے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کے شعبۂ اُردو کے صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اور وہیں سے پنشن لینے کے بعد اب صرف اُردو کی خدمت اور اس کی بہبودی ہی آپ کی زندگی کا مقصد ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں آپ کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اور پاکستان میں آج بھی اسی مقصد کے لئے اُردو کالج چلا رہے ہیں۔

عزیز مرزا کے بعد انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) کے معتمد اعزازی چنے گئے۔ اور یہ تو دُنیا نے دیکھا کہ اپنے منصب کا چارج لینے کے بعد انھوں نے انجمن ترقی اُردو کو دُنیا کی عظیم الشان اور ذی وقار انجمنوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ آل انڈیا اُردو کانفرنس جو ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں ہوئی تھی اس میں انجمن ترقی اُردو کا مرکز بجائے حیدر آباد کے دہلی منتقل ہونا قرار پایا اس رزولیوشن کے مطابق انجمن کا مرکز دہلی منتقل ہوا اور "دہلی قتل عام" کے قبل تک جو خدمات انجمن ترقی اُردو نے ہندوستان میں انجام دیا اس کا تفصیلی تذکرہ نہ میرا مقصد ہے اور نہ ممکن ہی ہے لیکن اتنا ضرور یاد دلاؤں گا کہ یہ سب بابائے اُردو ہی کے دم سے ہوا۔ دہلی کے خوں چکاں واقعہ کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کراچی چلے گئے اور وہاں رہ کر آج جو خدمات اُردو کی انجام دے رہے ہیں اور جو احسان اس زبان و ادب پر کر رہے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ میں اسوقت اُردو آنرز کا طالب علم تھا۔ یونیورسٹی کی کسی میٹنگ کے سلسلہ میں وہ علی گڑھ تشریف لائے تھے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کو اپنے یہاں شام کی چائے پر مدعو کیا تھا۔ مجھ پر اور لیث صاحب پر رشید صاحب کی چونکہ خاص شفقت تھی اس لئے انھوں نے ہم دونوں کو بھی بلا لیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اُردو ادب کے سب سے بڑے محسن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ ان کی صورت اور شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ باتیں کوئی علمی اور ادبی قسم کی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ مزاح کا رنگ غالب تھا۔

یہ ملاقات سرسری تھی ۱۹۳۶ء میں جب شعبۂ اُردو نے مجھ کو اور لیث صاحب کو "دکن کے قدیم مثنوی گو شعرا" اور "تذکرۃ الشعراء" پر تحقیقی مقالہ مرتب کرنے کے سلسلہ میں کتب خانہ آصفیہ سے استفادہ کے لئے حیدر آباد بھیجا اور ہم لوگوں کو ڈیڑھ دو مہینے تک عبدالحق صاحب کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اس وقت میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا اور انکی زندگی کے مختلف گوشوں پر مجھے نظر ڈالنے کا موقع ملا۔

۱۹۳۸ء میں جب انجمن ترقی اردو کا مرکز دہلی میں منتقل ہوا اور میں علی گڑھ سے ایم۔ اے کر چکا تو عبدالحق صاحب نے ۱۹۳۹ء میں "ہندوستانی ڈکشنری" مرتب کرنے کے سلسلہ میں مجھے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے دہلی بلا لیا۔ وہاں میں کسی نہ کسی طرح ۱۹۴۲ء تک رہا اور اس طویل عرصہ میں علمی، ادبی، معاشرتی اور اخلاقی کوئی پہلو بھی ان کی زندگی کا ایسا نہیں ہے جو میری نظر سے پوشیدہ رہا ہو۔ اور جس کا میں نے مطالعہ نہ کیا ہو۔

عبدالحق صاحب میں مروت اور سیر چشمی بدرجۂ اتم ہے اور اکثر اوقات لوگ ان کی اس صفت سے غلط فایدہ بھی اٹھا لیتے ہیں۔ دہلی میں قلمی کتابوں کے بیچنے والے اکثر ان کے یہاں آتے اور منھ مانگی قیمت لیکر جاتے۔ منیجر صاحب نے ایک دو مرتبہ اس طرف توجہ بھی دلائی لیکن غریب کتب فروش کی مایوسی کا خیال کرکے وہ کبھی بھی قیمت میں کمی یا لینے سے انکار نہ کر سکے۔ آخر منیجر صاحب نے دربان کے ذریعہ ایسے لوگوں پر ملاقات میں پابندی لگادی۔

عبدالحق صاحب کی رہائش بالکل انگریزی اور مغربی لیکن وضع قطع اور لباس نہ صرف مشرقی بلکہ مولویانہ ہے۔ حیدرآباد میں ان کا حسین اور آرام دہ بنگلہ اور اس کا قیمتی فرنیچر اور سامان آرائش قابلِ رشک تھا۔ حیدرآباد کے طویل قیام نے طبیعت میں ریاست اور درباداری پیدا کردی تھی شروع شروع جب میں حیدرآباد پہونچا تو ان کی شاہانہ کروفر اور مغربی طرز رہائش کو دیکھ کر متعجب ہوا اور میں اکثر سوچا کرتا کہ یہ وزرا جیسی طرز رہائش کیا ایک ادیب اور پروفیسر کے لئے موزوں ہے۔ دربان اور شاگرد پیشیوں کا ایک لشکر اور سب کے سب فرعون بے ساماں۔ ایک مرتبہ حیدرآباد کے کوئی ضعیف اور ستم رسیدہ شخص ہم لوگوں کی موجودگی میں عبدالحق صاحب سے ملنے آئے اور دو گھنٹے تک انتظار کرنے کے باوجود بھی باریاب نہ ہوسکے۔ دوسرے روز وہ پھر پہونچے اور پھر خبر کرائی لیکن ملازمین نے اطلاع کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی، تیسرے روز وہ پھر آئے اور گھنٹوں بیٹھے رہنے کے بعد بھی جب وہ باریاب نہ ہوسکے تو مجھے ان کی ضعیفی اور بے بسی پر ترس آیا۔ میں نے ان سے ان کے حالات پوچھے۔ کہنے لگے:

> "اوائل زندگی میں جب میں ایک ممتاز تاجر تھا۔ عبدالحق صاحب سے میرے روابط اور تعلقات تھے۔ بہار کے زلزلہ نے میرے کاروبار اور خاندان کو تباہ کر دیا۔ میں ایک سلسلہ میں حیدرآباد آیا تھا۔ خیال ہوا کہ عبدالحق صاحب سے بھی مل لوں۔ لیکن یہ ملازمین ملاقات نہیں ہونے دیں گے۔ اس لئے اب خودداری کا تقاضا نہیں کہ چوتھی مرتبہ پھر آؤں۔"

مولوی عبدالحق صاحب دن کا کھانا بہت عرصہ سے نہیں کھاتے۔ صرف شب کا کھانا کھاتے ہیں۔ حیدرآباد میں دن کا کھانا تو ہم لوگ تنہا کھا لیتے تھے لیکن شب کا کھانا برابر ساتھ کھاتے تھے۔ کھانے کے دوران میں وہ صد درجہ بے تکلف ہو جایا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر لوگوں پر پھبتی کسنا اور مذاق اڑانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور ان کی یہ کیفیت بعض مرتبہ حد سے اتنی تجاوز کر جاتی کہ مذاق سلیم پر ناگوار گزرتی، کبھی کبھی ہمارے اساتذہ پر بھی پھبتی کستے اور ہر جملہ کے بعد خوب خوب ہنستے۔ مجھے ان کی یہ بات ناگوار معلوم ہوتی لیکن خاموش رہتا۔ ایک مرتبہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا انھوں نے بری طرح مذاق اڑایا۔ اس روز میں اپنی طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور جواب میں کوئی سخت جملہ میں نے بھی کہدیا۔ میز پر سناٹا چھا گیا۔ اور مولوی صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر عابد حسین میری بغل میں تھے۔ سامنے مولانا احتشام الحق دہلوی مرحوم اور اختر رائے پوری تھے۔ کھانا ختم ہوا تو ڈاکٹر عابد حسین صاحب چہل قدمی کے بہانے مجھ کو علحدہ لے گئے اور سمجھانے لگے کہ مولوی صاحب کی یہ عادت سی ہو گئی ہے ان کو دل سے کسی کی تحقیر منظور نہیں، محض تفریحاً کھانے کے دوران میں اس طرح کی گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ آپ کو اس قدر سخت جملہ استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا اور آئندہ خاموش رہنے کا وعدہ کیا۔ لیکن مولوی صاحب اس روز سے مجھ کو مخاطب کرکے ہمارے اساتذہ کا مذاق اڑانے کے بارہ میں خود محتاط ہو گئے۔

عبدالحق صاحب کی طبیعت میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت زیادہ ہے ایک مرتبہ میز پر ایک صاحب کھانا کھا رہے تھے جب وہ اپنی انگلیاں چاٹ چکے تو جھٹ اپنی انگلیاں ان کے منہ کے پاس کر دیں کہ اسے بھی صاف کر دیں۔ لوگ ہنس پڑے اور وہ بزرگوار پسینہ پسینہ ہو گئے۔

مولوی عبدالحق صاحب سیاست کے بارے میں "باہمہ بے ہمہ" کا نظریہ رکھتے ہیں، ان کا سیاسی موقف اردو ہے اور صرف اردو۔ ہندوستان میں جب تک رہے "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کے اصول پر کانگرس، مسلم لیگ، ہندو مہا سبھا، کمیونسٹ اور سوشلسٹ، سبھوں سے سمجھوتہ کئے رہے، سیاست میں انھیں سب سے اتفاق رہتا ہے بشرطیکہ کوئی ان کی اردو سے اختلاف نہ کرتا ہو ورنہ پھر سے "من و گرز میدان و افراسیاب" پر اتر آتے ہیں۔

مذہب کے بارہ میں وہ ناقابل فہم ہیں۔ اتنے دنوں تک ساتھ رہنے کے باوجود بھی میں، ان کے متعلق کچھ نہیں جان سکا کہ وہ کیا ہیں۔ وضع اور صورت مولویوں کی، سیرت اور اخلاق صوفیوں اور درویشوں کا، عمل دہریوں کا۔ نماز وہ کبھی نہیں پڑھتے عید بقرعید کی بھی نہیں، روزہ ہر روز رکھتے ہیں اور کبھی بھی نہیں۔ یعنی دن کا کھانا عرصہ سے نہیں کھاتے، پانی گھنٹہ گھنٹہ پر پیتے ہیں اور حقہ ایک منٹ کے لئے بھی منہ سے جدا نہیں کرتے، مروت فیاضی، جود و سخا اور صداقت کے لحاظ سے وہ قرون اولیٰ کے مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ اخلاقی جرأت ان میں بہت ہے۔ دشمنوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک فیاضانہ اور دوستانہ ہوتا ہے۔

عام بڑے آدمیوں کی طرح ان میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی تعریف اور خوشامد سے خوش ہوتے ہیں اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی ان پر حاوی ضرور رہتا ہے۔ وہ دوسروں کے کہنے پر فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ اور جس پر اعتماد کرتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ جو ان پر حاوی ہو جاتا ہے اس کی ہر بات کو آمنّا و صدقنا سمجھتے ہیں۔ حیدر آباد میں اختر رائے پوری ان پر حاوی تھے۔ دہلی میں ہاشمی صاحب فرید آبادی ان پر حاوی تھے۔ آج کل کراچی میں معلوم نہیں ان پر کون حاوی ہے۔ جس کی نظر سے وہ سب کچھ دیکھتے اور جس کی زبان سے وہ سب کچھ بولتے ہیں۔

عبدالحق صاحب میں اعلیٰ ظرفی بہت زیادہ ہے وہ ادیبوں اور اسکالرز کی بہت زیادہ قدر اور عزت کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کام کرنے میں ہم لوگوں کو ان کی بزرگانہ عنایات اور شفقت کا بارہا تجربہ ہوتا تھا۔ انجمن ترقی اردو دہلی میں اسکالرز کے درمیان کچھ چشمک بھی رہتی تھی اور اس کی بڑی وجہ ایک دو حیدر آبادی افراد تھے جو وہاں کام کر رہے تھے ---------

گوری سرن لال سریواستو ام۔ اے علیگ بھی ہندوستانی ڈکشنری کے مرتب کرنے میں میرے ساتھ کام کر رہے تھے انکی عادت تھی کہ کام کرتے کرتے اکثر اپنے دارالمطالعہ سے اٹھ کر ہوٹل چائے پینے چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی بزرگ نے مولوی صاحب سے شکایت کی تو وہ منغض اور کبیدہ ہو کر بولے: "میاں! یہ علماء اور ادیبوں کے کام کرنے کی جگہ ہے، سرکاری دفتر نہیں ہے ریسرچ کرنے والے کلرک نہیں ہو سکتے۔ اس طرح کی پابندی نہ میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں نہ اپنے کسی رفیق کار کے لئے۔" شکایت کرنے والے بزرگ کو بڑی خفت ہوئی۔

عبدالحق صاحب میں انانیت اور علم کا غرور نام کو نہیں لیکن طرز رہائش میں رکھ رکھاؤ اور نفاست بہت ہے۔ طبیعت میں چڑچڑاپن پایا جاتا ہے۔ لیکن غالباً یہ کبر سنی اور غیر معمولی مشغولیت کے باعث ہے۔ اپنے حصول مقصد میں صد درجہ مستقل مزاج ہوتے ہوئے بھی وہ تلون طبع واقع ہوئے ہیں۔ خوشامد پسندی اور دربارداری نے ان میں بادشاہوں کی سی خصوصیت پیدا کر دی ہے یعنی "گہ بہ جوابے برنجند و گہ بدشنامے انعام بدہند"۔ ان کی اس خصوصیت کے باعث آج ان کو کوئی اپنا جانشین نہ مل سکا شبلی کو سید سلیمان ندوی، اور عبدالسلام ندوی کئی جانشین ملے جو ان کے مقاصد کو ان کی خواہش اور تمناؤں کے مطابق اب تک

پلا رہے ہیں۔ لیکن عبدالحق صاحب کو اپنی تمام تبحر علمی اور خلوص کے باوجود بھی کوئی معقول جانشین اب تک نہ مل سکا۔ دہلی میں اکثر وہ اس پر حسرت کرتے تھے اور متفکر رہتے تھے۔ اس کی وجہ بہت صاف ہے۔ شبلی اپنے عالمانہ اوصاف کے ساتھ ساتھ جمہوری زندگی گزارنے کے عادی تھے، اپنے رفقائے کار اور شاگردوں کے ساتھ وہ ایک سطح میں آ گرتے تھے، عبدالحق صاحب میں اسکی کمی ہے۔ وہ اپنے رفقائے کار اور شاگردوں کے ساتھ بھی بڑی رکھائی بلکہ حاکمانہ تیور سے ملتے ہیں۔ ان کی اس کمزوری کے باعث انھیں آج تک کوئی لایق جانشین نہ ملا۔

تصانیف کے معاملہ میں وہ ایک خاص قسم کے سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ دوسروں کی محنت اور کاوشوں سے طیار کردہ کتابوں پر اپنے نام کی مہر لگا کر دنیا کے سامنے پیش کر دینے میں انھیں ذرا جھجک نہیں ہوتی۔ ان کی یہ کمزوری خواہ حسد کی یا حرص کی بنا پر ہو لیکن بہت سے غریب ادیبوں کے لئے یہ حد درجہ تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" کو لیجئے۔ جس زمانہ میں اس کی ترتیب کا کام حیدرآباد میں ہو رہا تھا۔ میں کچھ دنوں تک وہاں رہا تھا۔ اس ڈکشنری کے مرتب کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کچھ اسکالرز تھے۔ عبدالحق صاحب کا کام اس پر نظر ثانی سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ ادبی اور علمی دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس میں عبدالحق صاحب اپنے تمام رفقائے کار کا نام بورڈ کی شکل میں لکھ دیتے اور خود کو اس تالیفی بورڈ کے صدر کی حیثیت سے پیش کرتے نہ کہ مصنف کی حیثیت سے چند پیسوں کے عوض جو ان مرتبین لغت کو معاوضہ کی شکل میں دئے گئے ان کو ان کے اتنے بڑے علمی کارنامے کی سرفرازی سے محروم کر دیا گیا۔

تحقیق اور تنقید انسانی دماغ کی دو مختلف تحریکیں اور صلاحیتیں ہیں۔ ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ یہ دونوں صلاحیتیں کسی ایک آدمی میں مجتمع ہوں۔ لیکن عبدالحق صاحب کا یہ کمال ہے کہ ان میں یہ دونوں صلاحیتیں بدرجہ اتم ہیں۔ جہاں ان کی علمی تحقیقات ہر طرح کی ہمت شکن اور صبر آزما دشواریوں پر غالب رہتی ہے اور عالمانہ موشگافیوں کی حامل ہے، وہاں ان کی تنقیدیں سنجیدہ طور پر [illegible]، کھرے کھوٹے اور اصل نقل میں فرق بتلا کر انشا پردازوں کو صحیح راستہ دکھلاتی ہیں۔ بلا شبہ حالی نے جسکی داغ بیل ڈالی تھی عبدالحق صاحب نے بہت حد تک اس کو تکمیل کی حد تک پہونچا دیا ہے۔ وہ جس کتاب پر تنقید کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو اس پر پہلے کامل عبور حاصل کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ ان کی تنقید میں تحقیق کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ اپنی رائے بے لاگ دیتے ہیں اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تنقید سے مصنف کی ہتک یا دلآزاری نہ ہونے پائے۔ کج فہمی اور کوتاہ نظری تو ان کے یہاں نام کو نہیں۔ جس کتاب پر تنقید کرتے ہیں اس کے مصنف کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا کوئی ہمدرد دوست اور شفیق بزرگ اس کی خوبیوں پر ہمت افزائی کرتے ہوئے غلطیوں سے خبردار کر رہا ہو۔ وہ سچ بوجھ اور صداقت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور نہ خارجی واقعات سے تنقید کرتے وقت متاثر ہوتے ہیں۔ تنقید کرتے وقت ان کا انداز ہمدردانہ ہوتا ہے۔ ان کے یہ چند جملے ان کو ایک نقاد کی حیثیت سے سمجھنے میں ہماری مدد کریں گے۔

> "غلطی تحقیق و جستجو کی گھات میں رہتی ہے ادب کا کامل ذوق سلیم ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے نقاد اور ماہر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ لیکن ان سے ان کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ غلطی ترقی کی مانع نہیں بلکہ وہ صحت کی طرف رہنمائی کرتی ہے پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو راستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے۔"

غرض یہ کہ عبدالحق صاحب کے یہاں بیجا سرزنش یا استہزا تنقید کرتے وقت روا نہیں۔ وہ مصنف کی غلطیوں کا انکشاف کرتے ہیں لیکن اس امر کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ اس انکشاف کے وقت مصنف کی تحقیر نہیں ہونے پائے۔ مثال ملاحظہ ہو:-

> "بعض بعض باتیں اس کتاب میں عجیب ملتی ہیں۔ جس سے ہمارا یہ شبہ قوی ہو جاتا ہے کہ قابل مولف چند کتابوں

> کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں اُن کا مطالعہ یا تو انھوں نے بالکل نہیں کیا ہے یا کیا ہے تو محض سرسری۔ مثلاً نورتن کے متعلق لکھتے ہیں کہ ابراہیم پہلا بادشاہ تھا۔ جس نے اُردو میں لمبی نظم لکھی ہے اس کا نام نورتن ہے اور موضوع موسیقی ہے۔ نورتن کو اُردو کی کتاب کہنا ایسا ہے جیسے کوئی گلستان جلی کو اُردو کتاب کہے۔ نورتن ٹھیٹ ہندی زبان میں ہے البتہ اسے اُردو سے مطلق کوئی واسطہ نہیں۔

عبدالحق صاحب کی زبان بہت رواں اور طرز تحریر پر زور ہے۔ ان کی تحریر میں غضب کا استدلال پایا جاتا ہے اور جو کچھ لکھتے ہیں اس کی بنیاد ٹھوس دلائل پر ہوتی ہے۔ غیر دلچسپ عالمانہ مضامین پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں تو اسے اپنی زبان اور طرز بیان سے حد درجہ دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ عربی فارسی کے ثقیل اور مغلق الفاظ سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھنؤ اسکول کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:-

> "لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی اور یہ ان کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں صاف نظر آتی ہے وہ تراش و خراش اور جدت پر مٹے ہوئے تھے اور عوام و خواص میں اس کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ اس لئے سب کے سب اُدھر ہی ڈھل گئے۔ اور ساری ہمت تکلفات میں صرف کردی۔ سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی۔ میر اور ان کے ہم عصروں کا اثر زائل ہو گیا۔ اور ان کی بجائے دوسرے استاد پیدا ہوئے جو اس سوسائٹی کے سپوت اور اسی تمدن کے پروردہ تھے۔ حضرت ناسخ اور ان کے بعد خواجہ وزیر، صبا، رشک، اور امانت وغیرہ کے کلام میں سوائے ضلع جگت لفظی، مناسبت اور تلازمہ اور دیگر تکلفات کے کچھ بھی نہیں۔"

پروفیسر محمد معین الدین دردائی

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

فہرست مضامین ملاحظہ ہو:-

فحاشی کی تعریف — فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب — شادی — اقسام ازدواج — شادی کی مختلف صورتیں — طلاق و خلع طلاق مختلف ممالک میں — مذہبی فحاشیاں — مذہب میں رواج فحاشی کے اسباب — مذہبی فحاشیوں کے عجیب و غریب قوانین — مذہبی فحاشیوں کی مرموز علامتیں — فحاشی پر عمومی تبصرہ — محافل نشاط عید الحمقاء عصمت فروشی وحشی اقوام میں — مقدس فحاشی ممالک مشرق میں — مسیحیت کا اثر فحاشی پر — قرونِ وسطیٰ کے ادارات فحاشی — اعلیٰ معیار کی پیشہ ور عورتیں — یورپ کی بعض تاریخی پیشہ ور عورتیں — قحبگی علم الحیوٰۃ کے نقطۂ نظر سے — قحبگی کا اخلاقی پہلو — فحاشی کا اثر تمدن پر — استلذاذ بالمثل اقوام قدیمہ میں — استلذاذ بالمثل کے مختلف نظریئے — استلذاذ بالمثل اور بعض مشہور افراد — عورتیں اور استلذاذ بالمثل — استلذاذ بالوحوش — استلذاذ بالنفس جانوروں میں — استلذاذ بالنفس انسانوں میں — استلذاذ بالنفس کی قدیم تاریخ — فحاشی عہد قدیم میں — فحاشی قرونِ وسطیٰ میں — عہد جدید اور فحاشی — اخلاق جنسی وغیرہ وغیرہ۔ قیمت علاوہ محصول چار روپیہ (للعہ)

منیجر نگار لکھنؤ

”گاہے گاہے باز خواں ——“

ہمارے موجودہ علماء کرام

کبھی آپ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ کیا وہ کوئی معمہ ہے جسے عقل انسانی اسوقت تک حل نہیں کرسکی، کیا وہ کوئی دقیق علمی مسئلہ ہے جس کی حقیقت کا علم ابھی تک نوعِ انسانی کو نہیں ہوسکا، کیا وہ خیالی تار و پود ہے جس کی گتھیاں کبھی سلجھائی نہیں جاسکتیں، کیا وہ فطرت کا کوئی ایسا راز ہے جو کبھی بے نقاب نہیں ہوسکتا اور کیا وہ کوئی شاعرانہ ادعا ہے جو کبھی ”شرمندۂ معنی“ نہیں ہوا؟

یقیناً مذہب ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی معمہ ہے نہ دقیق علمی مسئلہ، نہ وہ کوئی خیالی چیز ہے نہ فطرت کا عمیق راز، نہ وہ شاعری ہے نہ محض لفاظی، پھر کیا ہے؟

اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے صرف خدا کی پرستش و نیایش کا تو آپ کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہوگا کیونکہ اس سے نہ خدا کو کوئی فایدہ پہونچ سکتا ہے نہ انسان کو اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے بے چون و چرا ان صحائف پر ایمان لے آنے کا جنھیں ملہمات ربانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو آپ کو اس کے ماننے میں پس و پیش ہوگا، کیونکہ بغیر سمجھے ہوئے کسی بات کی تصدیق کرنا عقل انسانی کے منافی ہے، اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ مذہب نام ہے چند متعین حرکات و مراسم کا بعض مخصوص الفاظ کے زبان سے ادا کردینے کا تو آپ کو اس کی صحت سے اور بھی انکار ہوگا کیونکہ ان باتوں سے تاثرات دماغی کو کیا واسطہ —— لیکن اگر میں یہ کہوں کہ مذہب نام ہے —— احساس انسانیت کا تو غالباً اصولی نقطۂ نظر سے نہ زاہد متقشف کو انکار ہوگا اور نہ عقلیت پرست انسان کو —— پھر آپ کا وقت تو ضایع ہوگا لیکن آئیے چند لمحات اس کے سمجھنے میں بھی صرف کردیں کہ ”احساس انسانیت“ کیا چیز ہے۔

میں انسان پیدا ہوا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ واقعی انسان ہوں لیکن اگر میں چھری لے کر اپنے کسی عضو کو مجروح کر ڈالوں یا کسی بلند دیوار پر چڑھ کر نیچے کود پڑوں تو کیا آپ اس وقت بھی مجھے انسان کہیں گے؟ غالباً نہیں۔

زید نہایت زیرک انسان ہے لیکن دو اور دو کے مجموعہ کو وہ ہمیشہ تین سمجھتا ہے تو کیا آپ اس کی صحت عقل و دماغ کا یقین کریں گے؟ غالباً نہیں۔

حامد بڑا صاحب عقل و فراست انسان ہے لیکن کسی دوسرے شخص کو ذبح کر ڈالنے یا لوٹ لینے میں مطلق تامل نہیں کرتا تو کیا آپ اس کی فراست و دانائی کو تسلیم کرلیں گے؟ غالباً نہیں۔

اس لئے معلوم ہوا کہ انسان اس مخصوص ہیئت والی مخلوق کو نہیں کہتے جو خاص وضع کے جوارح و اعضا رکھتی ہے بلکہ انسان نام ہے اس خاص کیفیت عقل و شعور کا۔

(۱) جو خود اس کی ذاتی اہمیت کو معین کرتی ہے۔
(۲) جو عقل کا صحیح استعمال سکھاتی ہے۔
(۳) جو افراد انسانی کا احترام کرنا بتاتی ہے۔

اور اس لئے اگر ان میں سے کسی ایک حس کا فقدان کسی شخص میں پایا جائے تو ہم کہیں گے کہ وہ دائرۂ انسانیت سے خارج ہے۔

پھر آیئے غور کریں کہ مذہب و الحاد کے موجودہ دور کشمکش میں انسان کہاں پایا جاتا ہے اور کس کا ساتھ دینے میں انسانی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ مذہب کا تعلق جس حد تک بانیان مذہب سے ہے ہمیں اس میں حرف گیری کا کوئی موقع نہیں ملتا اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یہ احساس سہ گانہ پوری قوت کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ کیونکہ جس حد تک ذاتی اہمیت کا تعلق ہے وہ اپنے آپ کو فرستادۂ خدا اور مامور من اللہ کہکر انتہائی نقطہ تک کھینچ لائے اور جس حد تک استعمال عقل و فراست کا واسطہ ہے، اس کا بین ثبوت وہ ان جماعتوں کی صورت میں چھوڑ گئے جنھوں نے ان کو رسول و نبی مان کر ان کے کہنے پر عمل کیا اور جن کی عقلوں کو اپنے زمانہ کے مقتضاء کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ رہ گیا نوع انسانی کا احترام، سو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مقالاً نہیں بلکہ عملاً ہمیشہ اسی کا درس دیا۔

لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر بانیِ مذہب کے اٹھ جانے کے بعد اس کی تعلیم کا اثر ضعیف ہونے لگا اور یہ ضعف رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ گیا کہ مذہب کا صحیح مفہوم ہی لوگوں کے دلوں سے محو ہو گیا اور وہ چیز جس کا تعلق صرف فعل و عمل سے تھا، محض لفظی و مقامی ادعا ہو کر رہ گئی۔

مثلاً عہدِ سعادت کو لیجئے جب رسول اللہ زندہ تھے اور ان کی تعلیم زندہ تھی کہ اس وقت اپنے آپ کو "نحن مسلمون" کہنے والے کس نوع کے انسان تھے اور آج کس انداز کے ہیں —— اس وقت مسلم نام تھا ایک ایسے انسان کا جس کی ذاتی اہمیت کا یہ عالم تھا کہ جب مستعد ہو کر اس نے اپنی آستین الٹ دی تو یہ سمجھئے گویا زمانہ کا ورق الٹ دیا اور جب وہ دوسروں کی ہمدردی پر آمادہ ہوا تو اپنی جان قربان کرنے میں اس نے پس و پیش نہ کیا، رہ گئی عقل آزادی سو اس کا ثبوت "لا اکراہ فی الدین" سے زیادہ اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔

برخلاف اس کے آج کل ان اکابر اسلام کو دیکھئے جو اپنے بڑے بڑے عماموں اور لانبی لانبی عباؤں کے ساتھ تقدس اسلامی کا قدِ آدم اشتہار بنے پھرتے ہیں ان علمائے کرام اور صوفیائے عظام کو دیکھئے جو اپنی طویل الذیل داڑھیوں اور ڈھیلے ڈھالے فرقوں کے ساتھ ہیبتِ اسلامی کا دو پیکر مجسمہ نظر آتے ہیں کہ اگر کسی ایسی بستی میں جو انسانی عصیاں کاری سے تباہ و برباد ہو چکی ہے عدوان و معصیت کا کوئی صحیح مجسمہ نصب کیا جانا مقصود ہو تو ان سے بہتر "ماڈل" مل ہی نہیں سکتا —— ان کے جسم کے ایک ایک ریشہ کی پرورش، ان کے خون کے ہر ہر قطرہ کی روانی ایک مستقل یادگار ہے اس بدباطنی و کور نفسی کی، ایک طویل داستان ہے اس مکر و فریب اور زور و ریا کی جس کو اسلام نے بدترین لعنت قرار دے کر دنیا سے مٹانا چاہا اور اس جماعت نے بہترین ذریعہ فلاح و کامیابی سمجھ کر اختیار کر لیا۔

ان کے سر نمازوں میں اس لئے نہیں جھکتے کہ مقصود خدا کی پرستش ہے بلکہ صرف اس لئے کہ دوسروں کے سر ان کے سامنے جھکیں، وہ روزے اس لئے نہیں رکھتے کہ ابناءِ جنس کی عسرت و تنگدستی کا اندازہ کر کے ان کے ساتھ ہمدردی کریں بلکہ صرف اس لئے کہ بہتر سے بہتر غذائیں ان کے سامنے پیش کی جائیں، وہ اپنے مواعظ میں بخشش و عطا کی فضیلت اس لئے بیان نہیں کرتے کہ اس کی اہمیت کا خود انھیں بھی علی اعتراف ہے بلکہ محض اس لئے کہ دوسرے اپنی دولت ان کے قدموں پر ڈال دیں۔

ان خدا سے ڈرنے والوں کی اندرونی زندگی کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو کہ وہ اپنی شبستانِ عیش میں کیسی شاد کام اور عذاب الٰہی کی طرف سے کیسی مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا کی کوئی معصیت ایسی نہیں جو دوسروں کے لئے حرام اور ان کے لئے حلال نہ ہو اور فرائض اخلاق میں سے کوئی امر ایسا نہیں جو دوسروں کے لئے واجب اور ان کے لئے غیر ضروری نہ ہو۔ ان کا خدا تمہارا جیلہ

ہے، لیکن دوسروں کے لئے اُن کے لئے نہیں، اُن کا خدا رحیم و کریم ہے مگر صرف ان کے لئے دوسروں کے لئے نہیں اُن کی فردوس بھی علحدہ ہے اور ان کا حوض و کوثر بھی دوسرا، اُن کی حوریں بھی مخصوص ہیں اور اُن کے غلمان بھی منتخب۔ الغرض یہ جماعت جسم کے لحاظ سے "گاؤ پرداری" — اور نفس کے لحاظ سے "فرعون و نمرود" ہے ایک مستقل عذاب ہے جو انسانیت و اخلاق پر نازل ہوا ہے اور جو اصل سبب ہے موجودہ ارتداد و الحاد کا کیونکہ اُن کی زندگی، اُن کی تعلیم، اُن کا عجب و غرور نسلِ حاضر کے لئے جو یقیناً زیادہ تعلیمیافتہ اور زیادہ اہل تنقید کی ہے ایک ایسا حجاب ہے قبول مذہب کے لئے جس کا دور ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اُن بتوں کو مسمار نہ کر دیا جائے — پھر یہ خصوصیت صرف علمبرداران مذہب اسلام ہی میں نہیں پائی جاتی اور میرا مخاطبہ صرف انھیں سے مخصوص ہے بلکہ اس وقت تمام مذاہب عالم کے عالموں، پوجاریوں، راہبوں اور موبدوں کا یہی حال ہے اور اس لئے اگر ہم اُن کی تعلیمات اور ان کے حالات زندگی کو سامنے رکھ کر مذہب کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو ہم اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ "نجات انسانی" کبھی مذہب سے متعلق نہیں ہو سکتی — کیونکہ جس حد تک اعتماد نفس و احترام انسانیت کا تعلق ہے وہ یکسر نفس پرست و خود غرض واقع ہوئے ہیں اور ان کی ذہنی غلامی کا یہ عالم ہے کہ مذہب کے باب میں عقل سے کام لینا وہ کسی طرح گوارا کر ہی نہیں سکتے — یہاں تک کہ اب مذہب نام صرف اس چیز کا رہ گیا ہے جسے عقل انسانی قبول نہ کر سکے۔

اب مذہب کے مقابلہ میں الحاد و ارتداد کو دیکھئے جو اس وقت نہایت قوت کے ساتھ دُنیا میں پھیل رہا ہے، اس میں کلام نہیں کہ انسان کی ذاتی اہمیت اب اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا ہے اور اس کی تمام کارگاہ فکر عقل و علم پر قائم ہے، لیکن مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہ اجتماعی طور پر نوع انسانی کو کوئی فایدہ پہونچا سکتا ہے اور جب تک کوئی ادارہ حقیقتاً "احساس انسانیت" کو بیدار نہ کر سکے، ہم اسے امن و سکون کا ضامن نہیں کہہ سکتے۔

ہو سکتا ہے کہ ایک ملحد و منکر دنیا میں غیر معمولی دولت کا مالک ہو جائے، ممکن ہے کہ مذہب سے آزاد ہونے کے بعد انسان کی عقلی و ذہنی آزادیاں علوم و فنون میں بیش بہا ایجاد و اختراع کا سبب بن سکیں، لیکن کفر و الحاد میں کوئی ادنیٰ سی علامت بھی اس امر کی نہیں پائی جاتی کہ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنا سکھا سکے اور ساری دُنیا کے افراد کو کسی وقت ایک رشتہ سے وابستہ کر دینا اس کے امکان میں ہو، یورپ کی موجودہ علمی ترقیاں اور اسی کے ساتھ اس کا استعماری جذبہ اُس کی تجارتی حرص اور انسانیت سوز جنگی تیاریاں کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ دُنیا کو جس چیز کی ضرورت ہے اور عالم انسانی جس مقصود کے لئے تڑپ رہا ہے وہ نہ اس وقت کے بنائے ہوئے مذہب سے حاصل ہو سکتا ہے، ورنہ الحاد و لامذہبیت سے بلکہ

"مرد ایں رہ را نشانے دیگر ست"

پھر وہ نشان کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کون سا راستہ ہے جو منزلِ مقصود تک پہونچا سکتا ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب دنیا کی اس قوم کے لئے بہت مشکل ہے جو ذہنی غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفانِ نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہانِ ماہی۔ حُسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا و توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوضِ کوثر۔ امام مہدی۔ نورِ محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ وغیرہ۔ ضخامت ۶۲۴ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے۔ منیجر نگار لکھنؤ

اِدھر اُدھر سے

سمندر کے عجائب

کرۂ زمین کی سب سے زیادہ حیرتناک چیز اس کا سمندر ہے جو اس کے تین چوتھائی حصّہ کو گھیرے ہوئے ہے اور ہمارے کرہ کی یہ وہ خصوصیت ہے جو غالباً کسی دوسرے کرہ میں نہیں پائی جاتی۔ مریخ میں برفیلی چوٹیاں پائی جاتی ہیں، وہاں کچھ تری کا بھی پتہ چلتا ہے اور نباتات کا بھی لیکن سمندر وہاں نہیں ہے۔ زہرہ کے چاروں طرف نہایت غلیظ ابر پایا جاتا ہے لیکن ہمارے کرہ کے بادلوں سے بالکل مختلف ہے جس میں آکسیجن ہے نہ پانی۔ دوسرے سیارے اس قدر سرد ہیں کہ وہاں سمندر کا وجود ممکن ہی نہیں، چنانچہ مشتری کا ٹمپریچر صفر سے بھی نیچے ۲۱۶ ڈگری ہے اور زحل کا ۲۴۰ ڈگری صفر سے نیچے اور اس لئے یہاں ہر چیز منجمد حالت میں ہے۔

ہمارے کرہ میں پانی کی اس قدر زیادتی ہے کہ اگر زمین کی تمام خشکی کا حصّہ پانی میں ڈبو دیا جائے تو سمندر کا صرف اٹھارواں حصّہ اس کے لئے کافی ہوگا۔ اسی طرح اگر زمین کے نشیب و فراز کو دور کرکے اس کی سطح برابر کردی جائے تو سمندر کی سطح اس سے ۸ ہزار فٹ اونچی ہوجائے۔

سمندر میں پانی کہاں سے آیا؟ ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ یہ پانی آتش فشاں پہاڑوں سے آیا ہے۔ اول اول جب کرۂ زمین پیدا ہوا تو وہ مشتعل تھا اور اس کی بالائی سطح آہستہ آہستہ سرد ہوکر منجمد ہونا شروع ہوئی، لیکن اندرونی حصّہ بدستور گرم و مشتعل رہا اور اس کے بخارات اندر ہی اندر گھٹتے رہے، لیکن جب یہ بخارات بہت زیادہ ہوئے تو وہ زمین پھاڑ کر باہر نکلے اور پانی کا طوفان بن گئے، یہ سلسلہ زمانۂ نامعلوم سے برابر جاری رہا یہاں تک کہ لاکھوں سال میں اس پانی نے سمندر کی شکل اختیار کرلی۔

سمندر کی نیچے کی دُنیا کیسی اور کیا ہے اس کا صحیح حال ابتک نہیں معلوم ہوسکا، جس طرح زمین کے خشک حصّہ پر میدان، پہاڑ، درے اور گھاٹیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح سمندر کے نیچے بھی ہیں، لیکن سمندر کے میدان زیادہ وسیع، اسکے پہاڑ بہت بلند اور اس کی گھاٹیاں بہت گہری ہیں اور اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ اگر ہمالیہ کی ایورسٹ چوٹی کو جو ۲۹ ہزار فٹ بلند ہے، سمندر کے اندر ڈبو دیا جائے تو بھی سمندر کے پانی کی سطح اس سے ایک میل اونچی رہے گی۔

سمندر کے کنارے اس کی گہرائی ۲۰۰ سے ۶۰۰ فٹ تک ہوتی ہے، لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جایئے یہ گہرائی بھی بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ کہیں کہیں وہ ۶۰۰۰ میل تک پہونچ جاتی ہے۔ سمندر کے نیچے جو سلسلہ پہاڑوں کا پایا جاتا ہے وہ بہت عجیب و غریب ہے۔ چنانچہ بحر اٹلانٹک میں آئس لینڈ کے پاس جو کوہستانی سلسلہ زیر آب پایا جاتا ہے، اسکی لمبائی دس ہزار میل اور چوڑائی ۵۰۰ میل ہے۔ ہرچند ان پہاڑوں کی چوٹیاں پانی کے اندر ایک میل کی گہرائی میں ہیں لیکن ان میں سے بعض چوٹیاں پانی کے اوپر بھی آگئی ہیں اور انھوں نے جزیروں کی صورت اختیار کرلی ہے۔

کہیں کہیں زیر آب سطح پہاڑ بھی پائے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کے پہاڑ اب تک سیکڑوں کی تعداد میں دریافت ہوچکے ہیں، یہ بالکل زمین کی سطح کی طرح ہموار ہیں اور اگر پانی خشک ہوکر یہ سامنے آجائیں تو وہ ہزاروں میل کے مسطح میدان نظر آئیں

سمندر کا تموج بھی خاص چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سمندر میں موجوں کا اُٹھنا زیادہ تر ہوا پر منحصر ہے لیکن تموج کا سبب وہ اندرونی چشمے بھی ہیں جو اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آتے جاتے رہتے ہیں اور اس طرح سطح آب میں تموج پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جن مقامات میں بارش نہیں ہوتی وہاں کا پانی گرم ہوجانے کی وجہ سے ابخرات میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور اس طرح نمک کی مقدار زیادہ ہوجانے کی وجہ سے وہ نیچے کی طرف جاتا ہے اور دوسرے حصوں کا پانی اس کی جگہ لے لیتا ہے، اس سے پانی میں تلاطم پیدا ہونے لگتا ہے جس کا دوسرا نام تموج ہے، جو کافی نقصان کی چیز ہے۔ موجوں کی کمی و بیشی کا تعلق زیادہ تر ہوا کی رفتار پر ہے۔ موجوں کی بلندی تیز ہوا کی صورت میں ۱۶ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی جب ہوا طوفانی ہوجاتی ہے تو چالیس چالیس فٹ بلند موجیں سمندر میں اُٹھنے لگتی ہیں اور بعض بحری سیاحوں نے تو سو سو فٹ بلند موج کا مشاہدہ کیا ہے۔

جب سمندر میں کوئی موج اُٹھتی ہے تو اس کی بلندی رفتہ رفتہ کم ہوجاتی ہے لیکن اسکی لمبائی بڑھتی جاتی ہے اور ہزاروں میل تک چلی جاتی ہے، جس کی رفتار کبھی کبھی ۵۰۰ میل فی گھنٹہ تک ہوجاتی ہے۔

سمندر کی سطح برفانی تودوں کے پگھلنے سے اونچی بھی ہوجاتی ہے، چنانچہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ تمام برف کی چٹانیں پگھل جائیں تو سمندر کی سطح ۶۵ سے ۱۶۵ فٹ تک بلند ہوجائے اور زمین کا چوتھائی حصہ غرقاب ہوجائے۔

صرف ایک لفظ نے جاپان کو تباہ کردیا

دوسری جنگ عظیم میں ۱۹۴۵ء تک جاپان کی حالت بہت سقیم ہوگئی تھی۔ اتحادی فوجوں کے فضائی حملوں سے شہر کے شہر تباہ ہوچکے تھے، لاکھوں آدمی تباہ و برباد ہوگئے تھے، ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا، اور جاپان کا آخری بحری بیڑہ بھی تباہ کیا جاچکا تھا۔

اس وقت جاپان میں دو جماعتیں تھیں، ایک لڑائی جاری رکھنے کے حق میں تھی اور دوسری صلح کرلینے کے حق میں، آخرکار کثرتِ رائے سے یہ طے پایا کہ ہتھیار ڈالنا ہی مناسب ہے اور سوویٹ یونین کو بیچ میں ڈالنا چاہا کیونکہ اس وقت تک روس جاپان کے خلاف جنگ میں شریک نہ ہوا تھا۔ چنانچہ جاپان کا وزیر اعظم روسی سفیر جیکب ملک سے ملا۔ لیکن اس نے بے رُخی سے کام لیا۔ شاہ جاپان شاہزادہ کونوئی کو ماسکو روانہ کیا کہ وہ سوویٹ یونین سے اپیل کرے۔ لیکن اسٹالین اور مولوٹوف نے بھی کوئی توجہ نہیں کی اور یہ عذر پیش کیا کہ وہ پوسٹڈم کانفرنس میں شرکت کی طیاری کر رہے ہیں اور اس مسئلہ پر غور کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

پوسٹڈم پہونچ کر اسٹالین نے ٹرومین صدر امریکہ سے اس بات کا ذکر کیا اور ۲۶ جولائی ۴۵ء کو برطانیہ، امریکہ اور چین کے دستخطوں سے جاپان کو الٹی میٹم بھیجا گیا کہ یا تو وہ ہتھیار ڈالدے یا تباہ ہونے کے لئے طیار ہوجائے۔ یہ خبر سن کر جاپان بہت خوش ہوا کیونکہ شرائط صلح کافی نرم تھے اور ان میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں جاپان کی قومی حیثیت باقی رکھی جائے گی، وہ اپنی حکومت خود بنا سکے گا اور شاہ جاپان بھی اپنے تخت پر بدستور قایم رکھا جائے گا۔

شاہ جاپان نے اپنے وزیر خارجہ سے کہا کہ شرایط بہت مناسب ہیں اور انھیں قبول کرلینا چاہئے اور ۲۷ جولائی تک پوزیشن یہ تھی کہ سوا وزیر حربیہ کے سب نے متفقہ طور پر شرائط صلح مان لینا طے کرلیا، لیکن چونکہ پوسٹڈم کے شرائط صلح کا علم جاپان کو صرف ریڈیو کے ذریعہ سے ہوا تھا اور کوئی باقاعدہ اطلاع پوسٹڈم سے نہ آئی تھی، اس لئے سوال یہ تھا کہ محض ریڈیو کی اطلاع پر کوئی قدم اُٹھانا مناسب ہے یا نہیں۔

اس کے دوسرے دن جاپان کے وزیر اعظم کا اخبار والوں سے انٹرویو مقرر ہوچکا تھا اس لئے قرار یہ پایا کہ اخبار

والوں سے اس باب میں صرف یہ کہدیا جائے کہ جاپان اتحادی مطالبات کو رد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا لیکن وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کرسکا ہے۔

دوسرے دن ۲۸ر جولائی کو وزیر اعظم نے اخبار کے نمایندوں سے کہا کہ جاپان فی حال "Mokusatsu" کی پالیسی پر قایم ہے۔ جاپانی زبان میں یہ لفظ بہت مبہم سا مفہوم رکھتا ہے جس کے معنی رد کرنے کے بھی ہوسکتے ہیں اور "اظہار رائے سے احتراز" کرنے کے بھی۔

بدقسمتی سے انگریزی خبر رساں ایجنسیوں نے اس کا پہلا مفہوم قرار دیکر یہ خبر شایع کردی کہ جاپان' اتحادیوں کی شرائط صلح کو رد کردینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اس خبر کا امریکہ کے اخباروں میں شایع ہونا تھا کہ غصہ کی لہر دوڑ گئی اور ۲۸ر جولائی کے نیویارک ٹائمز میں یہ خبر شایع ہوگئی کہ چونکہ جاپان نے شرائط صلح رد کردئے ہیں اس لئے حملہ میں دیر نہ ہونا چاہئے اور امریکہ کے سکریٹری محکمۂ جنگ نے یہ بیان شایع کردیا کہ "چونکہ جاپان نے ہمارے شرائط رد کردئے ہیں اس لئے اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ جاپان کو سبق دینے کے لئے آٹم بم سے کام لیا جائے" ـــ اور اس طرح ہروشیما اور نگاسکی کی تباہی کا باعث صرف ایک لفظ تھا جس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں انگریزی اخباروں نے غلطی کی تھی۔

قصر بکنگھم

لندن کا قصر بکنگھم، شاہی محل ہے۔ اس کا پہلا مالک جان شفیلڈ ڈیوک آف بکنگھم تھا جسے ایک ڈچ انجینیر نے ۱۷۰۳ء میں تعمیر کیا تھا۔ ۱۷۶۱ء میں جارج ثالث شاہ انگلستان نے اسے ۲۱ ہزار پونڈ میں خرید کیا۔ ۱۸۲۵ء میں دوبارہ اس کی تعمیر و ترمیم ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۴۶ء اور ۱۸۵۶ء میں کچھ اضافہ کیا گیا اور ایک کمرہ رقص کا بنایا گیا جس کا طول ۱۱۱ فٹ اور عرض ۶۰ فٹ ہے۔ ۱۹۱۳ء میں اس کا روکار (صدر دروازہ کی طرف کا حصہ) دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

یہ قصر گویا عجائب خانہ ہے قدیم شاہی یادگاروں کا، آرٹ کے نمونوں کا، طلائی و نقرئی ظروف کا اور بہت سی ایسی عجیب غریب چیزوں کا جنھیں انسان کی نگاہیں اس وقت تک نہیں دیکھ سکیں۔ اس میں ۶۰۰ سے زیادہ کمرے ہیں اور ان میں صرف چند ایسے ہیں جنھیں اجازت لینے کے بعد لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی اس کی صفائی شروع ہوتی ہے اور ۶ بجے ایک پولیس کا افسر اس کا پھاٹک کھولتا ہے۔ ساڑھے ۶ بجے دودھ کی گاڑی اندر داخل ہوتی ہے اور اس کے بعد ایک بائسکل سوار لڑکا ملکہ الزبتھ کی پسند کے تین اخبار لیکر آتا ہے۔ ساڑھے سات بجے دو شاہی ڈاکئے زریں وردی پہنے ملکہ کی ڈاک سفید تھیلوں میں لیکر آتے ہیں اور ۸ بجے تک تمام سکریٹری، کلرک اور دفتر کے اہلکار اپنی اپنی میزوں پر پہونچ جاتے ہیں۔

ساڑھے آٹھ بجے ملکہ اپنی نشستگاہ میں اپنی ڈاک پڑھنا شروع کرتی ہیں اس حال میں کہ نیچے پائیں باغ میں بینڈ بجتا رہتا ہے ۲۴ گھنٹوں کے اندر سکریٹریز خطوں کا جواب دیدیتے ہیں لیکن خود ملکہ کسی پر دستخط نہیں کرتیں اس خیال سے کہ لوگ اسے فروخت نہ کرنے لگیں۔

ملکہ الزبتھ خانہ داری کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتی ہیں اور روزانہ وہ ہر شعبہ کو ہدایات دیتی ہیں۔ قصر بکنگھم کے ۶۰۰ کمروں میں ۲۰۰ کمرے بالعموم خالی رہتے ہیں۔ ان کمروں کی غلام گردش تقریباً تین میل ہے جن پر قرمزی رنگ کے قالین ہر وقت بچھے رہتے ہیں۔ یہ کمرے گویا بھول بھلیاں ہیں چنانچہ ایک بار ملکہ میری تین گھنٹے تک راستہ نہ پاسکیں ـــ باہر کا کوئی آدمی ان کمروں کو نہیں دیکھ سکتا۔ تخت شاہی کا کمرہ ۶۵ فٹ لمبا ہے اور ڈرائنگ روم کی لمبائی بھی اتنی ہی ہے۔ یہ دونوں کمرے حد درجہ آراستہ ہیں۔ آرٹ گیلری کا کمرہ ۱۵۰ فٹ لمبا ہے جسکی چھت شیشے کی ہے محل کو صاف رکھنے کے لئے ۲۰۰ آدمی نوکر ہیں، شاہی کمروں میں ۳۶ مقررہ خادموں کے علاوہ اور کوئی نہیں جا سکتا۔ سال بھر میں رقص گاہ کا کمرا استعمال میں آتا ہے۔ قصر اگرچہ لندن کے بیچ میں ہے پھر بھی اس کا احاطہ ۴۰ ایکڑ زمین کو گھیرے ہوئے ہے جس میں باغ، سبزہ زار، درخت، جھیل وغیرہ سب ہی کچھ موجود ہے۔ قصر کے اندر ۳۰۰ گھڑیاں لگی ہوئی ہیں جن کو کوکنے اور صاف رکھنے کی ایک خاص کمپنی ذمہ دار ہے۔ قصر کی حفاظت میں بڑا اہتمام کیا جاتا ہے اور ملکہ کی موجودگی میں ۲۴ سنتری اور ۵۰ پولیس سارجنٹ ہر وقت متعین رہتے ہیں ـــ جو سپاہی جھنڈے پر تعینات ہوتا ہے اس کا کام بہت سخت ہے کیونکہ ۵۰ فٹ بلندی پر اڑنے والے جھنڈے کو ہر وقت یہ دیکھتے رہنا کہ وہ صحیح رخ پر اڑ رہا ہے یا نہیں اور اس میں شکنیں تو نہیں پڑتیں' آسان کام نہیں ہے۔

انسان

عہدِ حاضر میں

پر افشاں سرمدی نغمے مرے بربط کے تاروں میں
نشاطِ جاوداں میرے گلستاں کی بہاروں میں
مری منت کشِ تعمیر ہے آسائشِ ہستی
ہوا میں تازگی رقصِ مسلسل آبشاروں میں
مری موجِ تبسم جلوہ دیتی ہے گلستاں کو
مری برقِ تجلی مسکراتی ہے ستاروں میں
غلط کیا ہے جو خود بینی مرا آئینِ ہستی ہے
کہ ہے خود حسن پنہاں بھی تو میرے بیقراروں میں
مرے ابرِ کرم سے زندگی ہے مستعار اس کی
وہ موجِ رنگ محوِ رقص ہے جو لالہ زاروں میں
مری عظمت کو یہ خاکِ پریشاں کیا سمجھ سکتی
فلک پر بھی تو کوئی تھا نہ میرے رازداروں میں
امینِ سرِ پنہاں آرزوئے قلبِ دوراں ہوں
فرشتے جس کو سجدہ کر چکے ہیں میں وہ انساں ہوں

اجل کیا ہے قضائے زندگی کا بیکراں ہونا
خزاں یعنی نئے جلووں سے نظمِ گلستاں ہونا
پہونچ سکتا نہیں دستِ حوادث میرے داماں تک
سکوتِ موج ہے بیتاب رہنا پرفشاں ہونا
جھکا سکتی نہیں میری جبیں دنیا کی رعنائی
کہاں میں اور کہاں سرگشتۂ سود و زیاں ہونا
مرا اک کھیل ہے یہ ناتمام افسانۂ ہستی
ابھی باقی ہے اسرارِ حقیقت کا عیاں ہونا
تباہی کے علم لہرا چکے پہنائے گیتی میں
یہ موجِ ناتواں اب چاہتی ہے بیکراں ہونا
محبت اک حقیقت ہے فنا مفہوم ہے جس کا
فنا اک راز ہے مطلب ہے جس کا جاوداں ہونا
زمیں سے تا فلک اجزائے ہستی جن سے رخشاں ہیں
مرے سینہ کے ہر گوشہ میں وہ اسرار پنہاں ہیں

ارادہ ہے ان اسرارِ نہاں کو برملا کر دوں
زمیں کو آسمانی عشرتوں سے آشنا کر دوں
سنواروں اس تکلف سے یہی بکھری ہوئی زلفیں
عروسِ دہر کے جلووں کو میں دانش ربا کر دوں
ہوئی مدت کہ دھندلے پڑ گئے ہیں نقش ہستی کے
ان اجزائے کہن کو اک لطافت پھر عطا کر دوں
محبت عہدِ نو میں نامۂ ہستی کا عنواں ہو
شبوں کو صبح کے مانند رنگیں ماجرا کر دوں
ہر اک ذرہ سے پھوٹیں سرمدی انوار کے چشمے
فنا کے دام سے ابنائے گیتی کو رہا کر دوں
مٹا کر تفرقے مزدوری و سرمایہ داری کے
علم حریتِ کامل کا دنیا میں بپا کر دوں
پھر ان ڈوبی ہوئی ہستی کی نبضوں میں لہو آئے
وہ عالم ہو کہ ہر ذرے میں لطفِ رنگ و بو آئے

(کاروان)

علی اختر

نظر سیہوری :-

رسم بندگی نکلی اُن کے آستانے سے
کفرِ عاشقی پھیلا میرے سر جھکانے سے

روح کو ملی تسکیں دل ہوا ہے آسودہ،
اُن کو یاد کرنے سے خود کو بھول جانے سے

میں نے تو چھپایا تھا رازِ غم کو خود سے بھی
آپ کی نگاہوں نے کہدیا زمانے سے

میری نسبتِ گلشن بجلیاں سمجھتی ہیں
حق تو مٹ نہیں سکتا آشیاں جلانے سے

زندگی کی راہوں میں دل اگر نہ ہو روشن
تیرگی نہیں مٹتی مشعلیں جلانے سے

دیکھنا قفس والو کس طرف گری بجلی،
یہ دھواں سا اُٹھتا ہے کس کے آشیانے سے

اہلِ ظرف سمجھیں گے میرے ظرف کی قیمت
مجھ کو کچھ نہیں شکوہ اے نظرؔ زمانے سے

معصیت پر جو کسی کی کبھی پڑتی ہے نظر،
دیکھ لیتا ہوں کہ دامن مرا تر ہے کہ نہیں

دیکھنے والے گلستاں کو ذرا غور سے دیکھ
لالۂ وگل میں مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں

لوگ کہتے ہیں گلستاں میں بہار آئی ہے
دیکھنا شاخ پہ کوئی گل تر ہے کہ نہیں

سمندر

(ساقی جاویدی بی اے)

یہ ابر و باد کا دمساز، زلزلوں کا امیں
یہ موج و سیل کی بستی، تلاطموں کی زمیں

یہ آندھیوں کا محل، بجلیوں کا گہوارہ
نگار خانۂ فطرت کا ایک شہپارہ

یہ ندیوں کا پسینہ، پہاڑیوں کا عرق
کتابِ شام و سحر کا یہ زرنگار ورق،

یہ وادیوں کا جگر یہ جبال و دشت کا دل
فراتؔ و نیلؔ کے دھاروں کی آخری منزل

فلک کی آنکھ کا آنسو، زمیں کے دل کی امنگ
یہ لوحِ خاک پہ تسنیم و سلسبیل کا رنگ

یہ صبح و شام کا شیشہ، یہ ماہ و سال کا جام
یہ ناخداؤں کا آقا، یہ کشتیوں کا امام.

یہ حوصلوں کی ترازو، یہ عزم کی میزان
یہ تند و تیز ہواؤں کی جنگ کا میدان،

زمیں کی اجلی قبا کا یہ سیمگوں دامن،
بنا ہے کتنے سفینوں کی میتوں کا کفن،

یہ کتنے قیصر و کسریٰ سے لے چکا ہے خراج
بدل چکا ہے یہ کتنی جلالتوں کا مزاج،

بہا چکا ہے یہ کتنے صلیب و منبر و طاق
اُڑا چکا ہے یہ کتنے تمدنوں کا مذاق

پلا چکا ہے زمانہ کو مصر و رومؔ کا خون،
زمیں سے اس نے اکھاڑے ہیں سطوتوں کے ستون

بنے ہیں جودیؔ و سیناؔ پہ اس نے سیل کے دام
غضب سے اس کے لرزتے ہیں آج بھی اہرام

ہلاکتوں کا یہ رہبر یہ ہیبتوں کا رسول،
سکھا رہا ہے زمانہ کو زندگی کے اصول

ببانگِ سیل و تلاطم یہ دے رہا ہے پیام
گلاب و عطر بناتے ہیں آدمی کو غلام،

اُٹھو زمیں پہ ابھی انقلاب لاتا ہے
قلاع و قصر پہ خونیں عذاب لاتا ہے

سکندر علی وجد:۔

بہت حسین، بہت شاندار گزرے ہیں   جو صبح و شام سرِ رہگذار گزرے ہیں
ترے ہی نقشِ قدم پر کھلے ہیں لالہ و گل   چمن سے یوں تو بہت گلعذار گزرے ہیں
جنوں کے جوش میں بھی تیرے در سے دیوانے   خموش مثلِ نسیمِ بہار گزرے ہیں
ہزار بار مری زندگی کی راہوں سے   خود اہلِ حسن بھی دیوانہ وار گزرے ہیں
سمیٹ لوں تو صنم خانۂ جہاں بن جائے   نظر سے حسن کے وہ شاہکار گزرے ہیں
کہیں ٹھہر نہ سکے وجد مہر و ماہ و نجوم
رہِ حیات سے بے اختیار گزرے ہیں

شوق کی داستاں کو طول نہ دے   حسن کا سلسلہ دراز نہیں
وقت گرم سفر ہے تیز چلو   ساری دُنیا حریمِ ناز نہیں
اپنے ہر غم سے دل ہے بے پروا   غمِ دنیا سے بے نیاز نہیں
گنجِ اسرار زندگی ہے وجد
موت کے پاس کوئی راز نہیں

دے سکے اہلِ محبت کب زمانے کو فریب   راز افشا کرگیا اندازِ بیگانہ ترا،
کس عقیدت اور محبت سے تراشے ہیں صنم
کعبۂ اہلِ نظر ہے وجد، بتخانہ ترا

ماتمِ تمنّا

عشق میں ضبط کا یہ جبر، عیاذاً باللہ
دل تڑپتا ہے مگر لب پہ نہ شیون ہے نہ آہ
مضطربِ جس سے میں ہو جاؤں، وہ اُن کا انداز
مطمئن جس سے وہ ہوں، اِتنا مرا حال تباہ
جان پامالِ ستم، ہوش تغافل پہ نثار
دل ہے مایوسِ کرم، دید سے محروم نگاہ
وہ اُدھر جلوہ گہِ ناز میں مصروفِ نشاط
آستاں اُن کا اِدھر میرے لئے حدِّ پناہ
خلوتِ ناز سے نکلے بھی اگر تفریحاً،
اور مجھے جلوہ نظر آ ہی گیا خواہ مخواہ

میں ہوا محوِ جمال اور اُدھر اُن کا یہ حال
بل جو ابرو پہ تو پھیرے ہوئے چشمانِ سیاہ
غیظ کی وجہ سمجھنے سے اِدھر میں قاصر
اور اُدھر وجہ بتانے سے اُنھیں بھی اکراہ
نہ اُنھیں فرصتِ پرسش نہ مجھے تابِ بیاں
کس مپرسی و خموشی ہی سے کرنا ہے نباہ
اک تبسم نہیں، اک حرفِ تسلی بھی نہیں
یعنی دل جوئیِ اربابِ وفا بھی ہے گناہ
نہ یہ جرأت ہے کہ سر اُن کے قدم پر رکھ دوں
نہ کوئی اور نکلتی ہے منا لینے کی راہ
آؤ ماؔنی کہ تمنّاؤں کا ماتم کر لیں،
یاس بھی آئے کہ امید تو ہوتی ہے تباہ
پھر بھی اک سلسلۂ جور ابھی باقی ہے
یہ تعلق بھی بہت خاص سہی، ماشاء اللہ
تھا اسدؔ منزلِ آخر پہ مگر اے ماؔنی
اُس سے اک منزل ابھی میرا سفر ہے کوتاہ
ابھی غالبؔ کی طرح میں یہ نہیں کہہ سکتا
"اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا"

ماؔنی جائسی

ندیمؔ جعفری:-

بہت شگفتہ و واضح، بڑے خلوص کے ساتھ
پیام تیری محبت کے آئے ہیں کیا کیا
یہ کون رات کو آیا نقاب اُٹھائے ہوئے
ستارے تا بہ سحر جھلملائے ہیں کیا کیا
خبر بھی ہے تری محفل میں جاں نثار ترے
زباں پہ شکوۂ بیداد لائے ہیں کیا کیا
بجا کہ دین کے تاریک راستوں میں ندیمؔ
چراغ کفر کے میں نے جلائے ہیں کیا کیا

مطبوعات موصولہ

آفتاب تازہ مجموعہ ہے وجد حیدر آبادی کی ۱۳ نظموں اور ۱۳ غزلوں کا جسے چیتنا پرکاش لمیٹیڈ حیدر آباد دکن نے نہایت اہتمام سے نفیس کاغذ پر پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

دس بارہ سال سے زیادہ کی بات ہے کہ جناب سکندر علی وجد کو میں نے سب سے پہلے یہیں لکھنؤ میں دیکھا تھا جب وہ حیدر آباد سول سروس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں غالباً سیتاپور میں کام سیکھ رہے تھے اور وقتاً فوقتاً لکھنؤ آتے رہتے تھے۔ یقیناً یہ زمانہ ان کی شاعری کی ابتدا کا تو نہ تھا، لیکن ان کی مقبولیت کی آغاز کا ضرور تھا۔

انھوں نے جب کبھی کرم فرمایا تو اپنا کلام بھی مجھے سنایا اور میں ان کے ذوق و آہنگ دونوں سے ہمیشہ لطف اندوز ہوا، کیونکہ جتنا اچھا وہ کہتے تھے، اس سے بہتر وہ پڑھتے تھے۔ اس کے بعد جب وہ حیدر آباد واپس گئے تو ان کا کلام جراید و رسایل میں نگاہ سے گزرنے لگا اور میں نے یہ دیکھ کر بڑی مسرت محسوس کی کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں گہرائی اور سنجیدگی بھی بڑھتی جارہی تھی، لیکن اب وہ غزل سے ہٹ کر نظم نگاری کی طرف زیادہ متوجہ نظر آتے تھے۔

۴۴ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام لہو ترنگ کے نام سے شایع ہوا اور ان کی معرکۃ الآرا نظم اجنتا کو بہت پسند کیا گیا۔ ان کی یہ نظم اس میں شک نہیں بڑی فن کارانہ چیز تھی، جسنے ان کی شاعری کا مستقبل واضح کردیا اور وہ ایک کامیاب نظم گو شعراء کی صف میں آگئے۔

اس کے بعد حال ہی میں ان کے کلام کا انتخاب انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شایع کیا اور اب یہ مجموعہ حیدر آباد کی ایک نئے پبلشر نے پیش کیا ہے۔

اس مجموعہ میں ۱۳ نظمیں ہیں اور اتنی ہی غزلیں۔ نظموں میں ایلورا بڑے پایہ کی نظم ہے اور اجنتا کے ساتھ ساتھ اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد دوسری طویل نظم "کاروانِ زندگی" بڑی جاندار چیز ہے جس میں انھوں نے دنیا کی موجودہ تحریکِ آزادی کے شاندار مستقبل کو پیش کیا ہے۔ رومانٹک نظموں میں رقاصہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے بہت لطیف شاعرانہ نقاشی سے کام لیا ہے۔

غزلوں کا حصہ، تغزل کے لحاظ سے نسبتاً گرا ہوا ہے اور ان میں نظم کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ انھیں بھی بے تکلف حصۂ نظم میں شامل کیا جاسکتا تھا۔

ہمیں یقیناً اس بات کی خوشی ہے کہ وجد نے نظم نگاری میں بڑی پختگی پیدا کرلی ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ ان کی غزلوں میں اب وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو ان کے ابتدائی دور کی غزلوں میں پائی جاتی تھی۔ شباب تو خیر ان کا ابھی ختم نہیں ہوا لیکن زمانہ نے غالباً احساس شباب کم کردیا ہے اور یہ ان کی شاعرانہ زندگی کا معمولی سانحہ نہیں۔

بہر حال وجد اس عہد کے نوجوان شاعروں میں خیال و بیان کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ ان کی شاعری کی ٹکنک ان تمام بدعتوں سے پاک ہے جو اس وقت کے بعض ترقی پسند شعراء کا تنہا سہارا ہے، اس لئے اس میں معنویت کے ساتھ ترنم بھی ہے اور خیال کے ساتھ فنی جمال بھی۔

ہمیں امید ہے کہ اہلِ ذوق وجد کے ان نقوشِ تازہ کو پسند کریں گے۔ کتاب کی قیمت اس کے حجم کو دیکھتے ہوئے زیادہ معلوم ہوتی ہے، لیکن آج کل کے مصارف اشاعت اور کلام کی خوبی کو دیکھتے ہوئے، ایسی زیادہ نہیں ہے۔

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہو اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہو، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخییل، اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اسکو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ - اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون ادبیہ حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD No A466

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

(فن انتقاد) پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین [illegible] ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جسمیں تقریباً تیس فسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں "مارس ہنڈس" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جسمیں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور انکے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے دو

سالنامہ سنہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقادوں نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کیلئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے، اس نمبر میں قیام رامپور، قیام حیدرآباد زمانہ کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی انکے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو روپیہ